رباعیاتِ آسی



ناشر نول کشور پریس لکھنؤ

رباعیاتِ آسی

یعنی

مولوی عبدالباری آسی الدنی مصور درد کا وہ کلام

جو بصورت رباعیات جمع کیا گیا ہے

باہتمام ۔ بی ۔ بی کپور سپرنٹنڈنٹ

نول کشور پریس لکھنؤ

سنہ ۱۹۴۸ء

قیمت مجلد عہ

غیر مجلد عہ

تعارف

مجھے یہ کیا خبر تھی کہ اپنے رفیق کار مولوی عبدالباری آسی کے کچھ سوانح حیات لکھنا پڑیں گے ۔ ۱۹۲۳ء سے ۱۹۴۶ء تک مرحوم کا ساتھ رہا اس اثنا میں گاہے گاہے بر سبیلِ تذکرہ جو کچھ حالات معلوم ہوئے وہ جہاں تک حافظہ نے یاری کی درج کرتا ہوں مولوی صاحب کی خود نوشتہ سوانح عمری سے خاصکر شاعری کے متعلق بہت کچھ اس میں مدد لی گئی ہے اس لیے کہ صاحب البیت ادری بما فیہ ۔

عبدالباری نام آسی تخلص ابن منشی خلیفہ حسام الدین احمد حسام شاگرد مرزا غالب ابن مولوی شیخ خدا بخش عاجز ابن شیخ عبدالحکیم عاشق عرف میاں تھن معاصر میر تقی مرحوم الدن تحصیل ہاپوڑ ضلع میرٹھ مولد ہے ۱۸۹۳ء میں ولادت ہوئی اور ۱۸۹۸ء سے سلسلہ تعلیمی شروع ہوا۔ ابتدائی کتابیں اپنے والد شیخ حسام الدین سے پڑھ کر فارسی کی تکمیل حافظ برکت علی صاحب سے کی ۔ عربی کتابیں مولوی سراج احمد سراج مرحوم سے پڑھیں مولانا محمود الحسن محدث دیوبندی سے بعض کتب فقہ وحدیث کا استفادہ کیا ۔ آسی صاحب فرمایا کرتے تھے کہ ایک مرتبہ حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندی بسلسلۂ سالانہ امتحان ہمارے قصبے میں تشریف لائے تھے مولوی سراج احمد مدرس تھے مجھ سے بھی کچھ سوالات کیے ۔ میرے جوابات پر اس قدر اظہار خوشنودی فرمایا کہ مجمع سے دریافت کیا کہ ان صاحبزادے کے والد ماجد کون صاحب ہیں ۔ جب والد صاحب تشریف لائے تو ان کو بہت بہت مبارکباد دی اور چندے کے سلسلے میں اُن سے مجوزہ رقم کے دو چند دینے کو ارشاد فرمایا چنانچہ والد صاحب نے نہایت خوشی سے

وہ رقم فوراً ادا کردی۔

کتب طب کی تکمیل ۱۹۰۸ء میں حکیم نواب جان مرحوم دہلوی سے کی حکیم نواب جان مرحوم ایک کامل طبیب تھے اور ان کے فیضِ صحبت سے مولوی صاحب مرحوم کو یہ ملکہ حاصل ہوگیا تھا کہ بڑے سے بڑے امراض کا علاج نہایت سہل الحصول دواؤں سے فرما دیا کرتے تھے اور بہت کم اس تجویز کردہ نسخے میں ترمیم کی ضرورت ہوتی تھی اور اگر کبھی ضرورت ہوئی تو صرف اوزان دوا کے گھٹاؤ بڑھاؤ سے کام لیا کرتے تھے یہی طریقہ حکیم نواب جان مرحوم کا بھی تھا۔

۱۹۱۰ء میں شاہجہانپور ضلع میرٹھ میں دو برس تک فارسی مدرس کی خدمات انجام دیں۔ ۱۹۱۳ء میں دفتر اخبار ہمدرد دہلی میں مولانا محمد علی مرحوم کے یہاں کام کرنا شروع کیا یہ وہ زمانہ تھا جبکہ جالب مرحوم ہمدرد کے اڈیٹر تھے ۱۹۱۴ء میں ہمدرد سے سلسلہ منقطع کرکے ۱۴ دسمبر ۱۹۱۴ء کو لکھنؤ آگئے اور یہیں مورخہ ۱۰ جنوری ۱۹۴۶ء کو عیش باغ لکھنؤ میں دفن ہوئے۔

مختلف احباب نے تاریخ وفات لکھی۔ یہاں صرف محمد نذیر صاحب نذیر موہانی کا قطعۂ ارتحال لکھتا ہوں:۔

قطعۂ تاریخ ارتحال مغفور مولانا عبدالباری صاحب آسی الدنی

نتیجۂ فکر جناب محمد نذیر صاحب نذیر موہانی

نکتہ سنجانِ شعر کی صف سے — اُٹھ گیا آہ ایک کاملِ فن
نام باری تخلص آسی تھا — دل نشیں اس کا تھا مذاقِ سخن
تھا اسی سرزمیں کا باشندہ — ہے جو میرٹھ میں قصبۂ الدن
شہر دہلی سے لکھنؤ آیا — لیے ہاتھوں میں شمعِ شعر و سخن

روشنی تیز کی تو آئے نظر | غالب و داغ انیس و میر حسن
سیکڑوں مستفید اس سے ہوئے | چشمۂ فیض تھا وہ کاملِ فن
آسی محسن تھا اور محسن کا | میلا ہوتا نہیں ہے تارِ کفن
پےِ تاریخِ رحلتِ آسی | ہاتفِ غیب کا ہے یہ قدغن

لوحِ تربت پہ جلد لکھ دو نذیر
مردمِ چشم تاجدارِ سخن
۱۹۴۶ء

دیوان اُردو غزلیات آسی ابھی تک غیر مطبوعہ ہے۔ ممکن ہے کوئی وقت آئے کہ وہ بھی شائع ہو جائے۔ البتہ مجموعہ رباعیات آسی اُن کے ورثا سے حاصل کر لیا گیا ہے جس کا طبع کرنا شایقین کے لیے عموماً اور تلامذۂ مولانا مرحوم کے لیے خصوصاً مطبع منشی نولکشور لکھنؤ نے منظور کر لیا ہے۔

مولوی صاحب کا برتاؤ اپنے احباب کے ساتھ نہایت مخلصانہ تھا اگر کسی سے مزاح فرماتے تو اس کی سخت سے سخت بات پر بھی اظہارِ ناراضگی نہ فرماتے بلکہ ہنس کر ٹال دیتے۔ زود گوئی کا یہ حال تھا کہ اکثر بیٹھے بیٹھے بہت سے عمدہ اشعار کہہ دیئے۔ حافظہ کا یہ حال تھا کہ فرمایا کرتے تھے مجھے فارسی، اُردو کے قریب قریب دس ہزار شعر یاد ہیں۔

آسی صاحب کی شاعری کی ابتدا کسی تشویق و ترغیب کی مرہونِ نہیں بلکہ اس وقت سے جب سے انشاءِ خلیفہ اور انشاءِ مادھو رام وغیرہ پڑھتے تھے اس کا شوق دل میں جاگزیں تھا۔ تا اینکہ ایک روز کہیں جاتے ہوئے یہ شعر خود بخود موزوں ہو گیا ؎

کیا تم نے زخمی کیا دل ہمارا | بڑا تیر مارا بڑا تیر مارا

یہ واقعہ غالباً ۱۹۰۴ء کا ہے اس کے بعد قریب قریب روزانہ شعر موزوں کرتے

اور ۱۹۰۶ء تک مشقِ سخن بغیر کسی تخلص کے جاری رہی - ایک دوست کی صلاح سے عاصی تخلص بھی قرار دیا گیا -

اُسی زمانے میں مولانا سراج احمد صاحب نے مشقِ سخن کرانا شروع کی ایک طرح دیدیتے اور شاگردوں کو حکم دیتے کہ اس پر طبع آزمائی کرو - چنانچہ پہلی طرح یہ تھی ع "مسافر ہے تو عقبیٰ کا ارے نادان پردیسی" آسی صاحب اور دوسرے ہم سبقوں نے اس پر غزلیں کہیں شدہ شدہ موزونی طبع کا حال آسی صاحب کے والد کو معلوم ہوا جو فارسی، اُردو کے اچھے شاعر تھے اُنھوں نے ایک بار یہ طرح دی ع

"اُٹھاؤ گٹھری سنبھالو بستر کہ رات اب کچھ نہیں رہی ہے"

آسی صاحب نے اسی طرح پر غزل کہہ کر سُنائی خوش تو ہوئے مگر یہ فرمایا کہ ابھی بہت کمی ہے کبھی کبھی کسی شعر پر اصلاح بھی دیدیتے -

اس وقت سے آسی صاحب نے فارسی دیوانوں کا مطالعہ کرنا شروع کر دیا - اور خصوصیت سے اپنے پردادا کے دیوان کو پیشِ نظر رکھا - اس وقت تک نہ ایسی ضخیم کتاب کی کچھ قدر تھی اور نہ اس سے زیادہ لطف اندوز ہو سکتے تھے - جابجا اس دیوان کے حاشیہ پر لکھا تھا کہ یہ غزل میر تقی کی غزل پر کہی اور میر صاحب کو سُنائی میر صاحب نے اس کی بڑی داد دی - کہیں لکھا تھا کہ میری اس غزل پر میر نے غزل کہی مگر اس سے اچھا نہ کہہ سکے - اور میں نے ان کے اس اس شعر پہ اعتراض کیے - کہیں سودا کی ملاقات، کہیں قائم چاندپوری سے ارتباط کا ذکر تھا - فارسی دیوانوں کو آسی صاحب نے اپنا رہبر بنا رکھا تھا -

سب سے پہلے اُردو میں دیوانِ غالب کو اپنے والد سے سمجھا اور مثنوی گلزارِ نسیم کو سبقاً سبقاً پڑھا تاآنکہ سنہ ۱۹۱۰ء میں مولانا سید ابوالحسن ناطقؔ سے ملاقات ہوئی - ناطق صاحب، چونکہ آسی صاحب کے عزیز بھی تھے اور اسی قرابت کی وجہ سے

ناطق صاحب کی ہمشیرہ کی شادی میں آسی صاحب کا گلاوٹھی ضلع بلند شہر جو ناطق صاحب کا مسکن ہے جانا ہوا تھا وہاں شعر و شاعری کا خاص چرچا تھا۔ ناطق صاحب کا یہ شعر سُن کر ؎

اب اس کو کیا کرے کوئی اگر تم کو نہ باور ہو بتو! کہتا تو جاتا ہوں مسلماں ہو تو کافر ہو

آسی صاحب اس شعر کو سُن کر ایسے وارفتہ ہوئے کہ اصلاحِ سخن کی خواہش ظاہر کی ۔ مولانا ناطق نے ازراہ مہربانی یہ استدعا منظور فرمائی اور تخلص بجائے عاصی کے آسی تجویز فرمایا۔ ۱۹۱۴ء و ۱۹۱۵ء تک کلام دکھاتے رہے اس کے بعد ناطق صاحب نے کچھ ایسی ہمت افزائی فرمائی کہ جس پر آسی صاحب کو بہت ناز تھا ۔

اس جا سے مولوی صاحب کو تین خانوادوں سے استفادہ حاصل کرنے کا موقع ملا ۔

مولانا سید سراج احمد سراج شاگرد بیانِ یزدانی میرٹھی خلیفہ شیخ حسام الدین حسام شاگرد مرزا غالب ۔ مولانا سید ابوالحسن ناطق شاگرد داغ مرحوم ۔ مولوی صاحب نے دو تین غزلوں کی اصلاح داغ مرحوم سے بھی لی تھی مگر اس فن خاص میں حقیقی استفادہ ناطق صاحب سے ہی حاصل تھا ۔

آسی صاحب نے شاعری میں مختلف اسکولوں اور مشاقوں کا اتباع کیا۔ ابتدا میں ناسخ کے رنگ پر بہت سی غزلیں کہیں بعدہٗ مولانا حالی کے طرز پر اشعار کہے ۔ ایک زمانے میں یہ خیال ہوا کہ ہر شعر میں کوئی محاورہ نظم ہونا چاہیے۔ ایک زمانے میں ایہام و تناسب مرغوب طبع رہا جس کے متعلق مولانا ناطق نے تنبیہی الفاظ میں سخت ممانعت کی ۔

اس کے بعد داغ کے طرز پر طبع آزمائی کرتے رہے مگر ۱۹۱۷ء میں جب

لکھنؤ تشریف لائے اس وقت انجمن معیار کا بہت زور و شور تھا اور اساتذہ لکھنؤ غالب کے طرز پر طبع آزمائی کرتے تھے آسی صاحب نے بھی اسی شاہ راہ کو پسند کیا مگر بعد چندے تنبہ ہوا کہ "ایں رہ کہ تو میروی بترکستان است"، بین و بکار اور رثا کی شاعری کو چھوڑ کر فلسفیانہ انداز مرغوب ہوا۔ مگر جلد ہی منکشف ہو گیا کہ شاعری کو محض فلسفے اور تصوف کی جولانگاہ بنا دیا جائے تو شاعری سے اس کو دور کا بھی لگاؤ نہیں ہوتا۔

میر۔ مرزا غالب۔ مرزا داغ کا رنگ پہلے بھی مرغوب تھا مگر آسی صاحب اُن میں سے کسی کے پابند نہ تھے۔ آسی صاحب کا یہ مسلک تھا کہ شاعر اگرچہ اصنافِ سخن میں سے کسی خاص صنف کا دلدادہ ہو تو کوئی حرج نہیں مگر اس کی مشق ہر صنف میں ہونا چاہیے۔ عشق و محبت کے جذبات اثر و تاثیر سے کوئی شعر خالی نہ ہو پھر اثر کے معنے سوگوارانہ بیان اور موت کے تلخ مناظر پیش کرنا نہیں جیسا کہ بعض حضرات کی پوری غزل میں کوئی شعر ایسا نہیں ہوتا کہ وہ سوائے مرگ۔ اور مایوسی کی زندگی کے ایک خوشگوار خوش انجام لمحے کی بھی تصویر کھینچ سکے۔ آسی صاحب کا کلام غزل، نظم، قصائد، مثنوی، رباعیات وغیرہ تمام اصناف سخن میں بہت ہے مگر ان کے نزدیک غزل اور رباعی سب سے زیادہ محبوب چیز تھی۔

آسی صاحب کی تصانیف اکثر ناول اور شرح تحفۃ العراقین اور شرح دیوان غالب اور ترجمہ دیوان حافظ، ترجمہ گلستاں، ترجمہ فرہنگ انند راج اردو اور تین تذکرے خاص چیزیں ہیں اور عام تصنیفات کی تعداد تیس پینتیس تک پہنچتی ہے۔

آسی صاحب کے شاگردوں کی تعداد یوں تو سو ڈیڑھ سو تک پہنچتی ہے جو سب خوش گو خوش فہم ہیں مگر شوکت تھانوی، امین سلونوی، عمر انصاری، شہید بدایونی زخمی لکھنوی، حیرت لکھنوی، اسعد الہ آبادی، آزاد لکھنوی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

آسی صاحب کے انکسار اور حق پسندی کا یہ حال تھا کہ بسا اوقات شعر کہتے اور مجھ سے دریافت فرماتے کہ ان دو شعروں میں جو ہم مضمون ہوتے کون شعر اچھا ہے۔ میں ہر چند کہتا کہ مولانا مجھ کو اس فن سے دور کا بھی لگاؤ نہیں میں کیا جانوں۔ تو فرماتے کہ اگر سخن گو نہیں ہو تو سخن فہم تو ہو میں اپنے خیال کے مطابق کسی شعر کو پسند کرتا تو نہایت خوش ہو کر فرماتے کہ ہاں یہ ہی مجھ کو بھی پسند ہے۔ اور گاہے گاہے مشاعروں میں اپنے ہمراہ لے جاتے۔

آسی صاحب کا خیال تھا کہ شاعر کے لیے صرف لکھنؤ اور دہلی کا زبان داں ہونا کافی نہیں بلکہ دہلی اور لکھنؤ دونوں کے زبان داں ہونے کے ساتھ ساتھ دونوں زبانوں میں فرق و امتیاز کر سکے۔ دیوان اُردو غزلیات آسی ابھی تک غیر مطبوعہ ہے ممکن ہے مستقبل قریب میں شائع ہو کر نذر ناظرین ہو جائے۔

البتہ "رباعیات آسی" ان کے ورثاء سے حاصل کر کے مطبع منشی نولکشور لکھنؤ نے شائقین کے لیے عموماً اور تلامذہ مولانا کے لیے خصوصاً طبع کر کے شائع کیا۔

سید جعفر علی مصحح

وبہ نستعین

نحمدہٗ و نصلی علیٰ رسولہِ الکریم

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ردیف الف

عاشق ہی نہو کوئی تو پھر یار سے کیا
مشتاق نہو کوئی تو دیدار سے کیا
آنکھیں ہی جس کے پاس ہوں اے آسیؔ
اُس کو ظلمت سے کیا اور انوار سے کیا

ہونٹوں کو ہنسی سے آہ سینا ہی پڑا
جام مے رنج و غصہ پینا ہی پڑا
موت اپنی مُراد پر نہ آئی افسوس
اوروں کی مُراد بن کے جینا ہی پڑا

وہ جلوہ بدیدہ یار ہو جائے گا
راز اُس کا سب آشکار ہو جائے گا
ہم آئینہ ہیں تو وہ ہے خود بیں آسیؔ
آخر ہم سے دو چار ہو جائے گا

خلعتِ راحت کا تن پہ سینا کیسا | جامِ صہبائے عیش پینا کیسا
ہم ہیں اور دردِ یاس و ناکامی ہے | مرنا بھی نہیں نصیب جینا کیسا

وہ نقطۂ نغز اگر نہ پیدا ہوتا | کیوں دائرۂ فلک ہویدا ہوتا
محبوبِ خدا اگر نہ ہوتے احمدؐ | والہ ہوتا کوئی نہ شیدا ہوتا

ہر بزم میں اک قرب اسے حاصل تھا | یہ باعثِ ہنگامۂ صد محفل تھا
جس پر سے گزر رہا ہے تو اے غافل | یہ مشتِ غبار بھی کسی دن دل تھا

بے بود میں شانِ بود پیدا کرنا | اور ظاہر حسنِ خود میں اخفا کرنا
کاغذ کی طرح آگ لگا لے دل میں | گر چاہے ہزار طرح جلوا کرنا

کب تک یہ غموں سے ٹھنڈی سانسیں بھرنا | کب تک یہ رنج اور تاسف کرنا
کب تک طربِ نے سے یہ تنفر ایسی | کب تک اس زندگی کے اوپر مرنا

کچھ درد و الم جہان سے کہنا ہوگا — کچھ رنجِ فشارِ قبر سہنا ہوگا
کچھ روز اڑیں گے خاک بن کر ہر سمت — سو طرح سے اس جہان میں رہنا ہوگا

اس دل میں کبھی خوشی کا عنوان دیکھا — اس دل میں کبھی غموں کا ساماں دیکھا
القصہ اسی میں عمر گزری آسی — اک بحر میں سو طرح کا طوفاں دیکھا

مانا کہ تو ہر رازِ نہاں کو سمجھا — مانا کہ تو رمزِ دو جہاں کو سمجھا
کیا فائدہ لیکن اس سمجھ سے آسی — اب تک جو نہ اپنی چیستاں کو سمجھا

طے منزلِ غم کو عمر بھر میں نے کیا — اس راہ کو قطع بے خطر میں نے کیا
ہر آبلۂ پا کی طرح اے آسی — اس دشت میں سر کے بل سفر میں نے کیا

انجامِ سُرور درد و کُلفت نکلا — رہنا دنیا میں سخت آفت نکلا
پڑتے ہی طمانچۂ مُغنّیِ اجل — میں دائرے سے صدا کی صورت نکلا

ہر دم جو بدلتی ہے زمانے کی ہوا — پھر بود و نبود کا ہے تجکو غم کیا
موجود جو شے ہے اُس کو معدوم سمجھ — معدوم جو شے ہے اُس کو موجود بنا

کچھ کام نہیں ہے بے نیازی کے سوا — کچھ شغل نہیں ہے چالبازی کے سوا
ہم دیکھ چکے زمانے بھر کو آسی — کچھ اس میں نہیں زمانہ سازی کے سوا

تجرید کا جب سے درس حیرت نے دیا — ہستی ہی کا پاک ہو گیا سب قصا
فریاد کا قصد رہ گیا تھا آسی — وہ بھی دلِ گمشدہ کے ہمراہ گیا

میں آپ سبب ہوا پشیمانی کا — میں آپ ہوں ذمہ دار نادانی کا
مجموعۂ تمیز جسے سمجھا تھا — در اصل وہ نقش تھا پشیمانی کا

ہر چند قرار و صبر معدوم ہوا — مقصود کسی طرح نہ مفہوم ہوا
معلوم ہوا ہے رازِ ہستی، لیکن — ہم بھی تو سنیں وہ کس کو معلوم ہوا

دورِ عشرت سے شاد ہونا سیکھا — رنگِ عبرت سے ہوش کھونا سیکھا
گل نے دی تھی مجھے ہنسی کی تعلیم — شمعِ محفل سے میں نے رونا سیکھا

ساقی مے دے کہ دورِ گلزار گیا — مطرب کچھ گا، کہ وقتِ گفتار گیا
اے ہمنفس اور کوئی قصہ نہ سُنا — اُس وقت کا ذکر کر کہ جب یار گیا

غربت کے ستم سے میں جو مجبور ہوا — تو جذبِ خیال مجکو منظور ہوا
اُتنا اُتنا وطن مرے پاس آیا — جتنا جتنا وطن سے میں دور ہوا

بچپن کا زمانہ کھیل میں صرف ہوا — اور وقتِ شباب خوابِ غفلت میں گیا
لے دے کے رہی تھی ایک پیری باقی — پیری آئی تو موت کا ہے دھڑکا

چہرے کا نقاب ہو گئی ہے دُنیا — آنکھوں کا حجاب ہو گئی ہے دنیا
جب سے دنیا سے میں نے مُنہ موڑا ہے — بھولا ہوا خواب ہو گئی ہے دنیا

جانے کے لئے سوئے جہاں کیوں آتا
کرتا ہوا نالہ و فغاں کیوں آتا
ہوتا جو مرے ہی بس میں آنا جانا
تو کوفت اٹھانے میں یہاں کیوں آتا

مخمورِ شرابِ بے نیازی ہو جا
مجبورِ معاصی و مناہی ہو جا
مشکل نہیں کچھ خدا کا راضی ہونا
پہلے تو تو خدا سے راضی ہو جا

ہر کوئی یہاں وفا کا بندہ ہو گا
اک در پہ ہر ایک سر فگندہ ہو گا
ویرانۂ دہر کو ذرا غور سے دیکھ
ہر ذرّے پہ کوئی نام کندہ ہو گا

پورا مرا مدّعا یقینی ہو گا
دل غم سے کبھی جدا یقینی ہو گا
مانا کہ یہ ایک بحرِ بے پایاں ہے
پھر بھی کوئی ناخدا یقینی ہو گا

جو ہو نہ سکا وہ کیا گوارا ہو گا
کب غیر کے ساتھ میں گزارا ہو گا
وہ خانہ خراب دل جو میرا نہ ہوا
کس مُنہ سے کہوں کہ وہ تمھارا ہو گا

ہر چند کہ تیز جا رہا ہے دریا — لاکھوں طوفاں اُٹھا رہا ہے دریا
تنکوں کو نہ چاہیئے شکایت پھر بھی — تنکوں کو نہیں ستا رہا ہے دریا

مقصودِ دلی زباں پہ لانا کیسا — اور بہرِ دعا ہاتھ اُٹھانا کیسا
عالم ہے خدا تو اے خدا کے بندے — ہر وقت خدا کو آزمانا کیسا

ہے مرد تو وقفِ درد ہو کر رہ جا — ہر خواہشِ دل سے فرد ہو کر رہ جا
مشکل نہیں کچھ عروج ہونا، لیکن — اُڑنے کے لئے تو گرد ہو کر رہ جا

آسیؔ غمِ جاں سے گزرنا اچھّا — مر جانے سے آپ پہلے مرنا اچھّا
جو چیز بجبر چھین لی جائے گی — اُس چیز کا خود ہی وقف کرنا اچھّا

رازِ دنیا بیاں نہ ہوگا نہ ہوا — یہ بھید کبھی عیاں نہ ہوگا نہ ہوا
بیکار ہے جستجو تری اے آسیؔ — ایسا تو کبھی یہاں نہ ہوگا نہ ہوا

زر جمع کیا بلا نہیں کوئی صلا　　زر سے مرا غنچۂ تمنا نہ کھلا
زر اصل میں اک بلائے جان تھا آسی　　زر پاس سے جب گیا تو آرام ملا

بیشک اچھا ہے اُس کی طاعت کرنا　　بیشک مرغوب ہے عبادت کرنا
لیکن ڈرنا نہ چاہیئے اے واعظ　　اللہ سے چاہیئے محبت کرنا

بجلی ہے تو جا سحاب میں گم ہو جا　　قطرہ ہے تو بحرِ آب میں گم ہو جا
بے قدری و ناکسی سے اتنا نہ تڑپ　　اے ذرے پھر آفتاب میں گم ہو جا

مشکل ہے غنا میں بے تمتّع رہنا　　میخانے میں جا کے بے تجرّع رہنا
یہ عالمِ صنع ہے یہاں اے آسی　　دشوار ہے تیرا بے تصنّع رہنا

جو دل میں ہے اُس کو لب پہ کہنا کیسا　　کیا جانے وہ سمجھے تجھکو کیسا کیسا
دینا ہے جو کچھ وہ خود ہی دے گا تجھکو　　دربارِ کریم میں تقاضا کیسا

دُنیا سے ہے رازِ قُدس پنہاں تیرا
پاتے نہیں بھید خیر و عصیاں تیرا
موسیٰؑ سے ہوا تھا فائدہ کیا تجکو
فرعون نے کیا کیا تھا نقصاں تیرا

سرمایۂ عافیت کو کھونا ہی پڑا
اس ناؤ کو بیچ میں ڈبونا ہی پڑا
انجامِ وفا سے پہلے دی جانِ عزیز
قِصّہ جو طویل تھا تو سونا ہی پڑا

مفلس نے کہا کہ اک بلا ہے دُنیا
منعم نے کہا میری خدا ہے دُنیا
لیکن دونوں کو کچھ نہیں ہے معلوم
دونوں نہیں جانتے کہ کیا ہے دُنیا

پیدا جب سے جہانِ ایجاد ہوا
اک شاد یہاں تو ایک ناشاد ہوا
یہ فطرتِ منقلب رہی آخر تک
دُنیا اُجڑی تو محشر آباد ہوا

اک مُرغِ چمن قفس سے آزاد ہوا
گلشن میں گیا اُڑا بہت شاد ہوا
لیکن ابھی آشیاں میں پہنچا بھی نہ تھا
اُڑتا ہوا پھر اسیرِ صیّاد ہوا

دُنیا دریا ہے اور ہم موج آسا
دریا کے تموّج سے ہوئے ہیں پیدا
دنیا ہی فنا کرے گی ہم کو اک روز
دریا ہی میں ڈوبتے ہیں نقشِ دریا

یا غرقِ خیالِ التذاذی ہو جا
یا مستِ شرابِ بے نیازی ہو جا
یا محوِ رضائے دوست ہو جا اکبار
یا ترکِ وفا پہ اپنے راضی ہو جا

اندیشہ خوشی سے غم کا ہوتا ہی رہا
آرام بھی پا کے عیش کھوتا ہی رہا
ہر غنچہ کھلا مگر میں دلتنگ ہی تھا
ہر پھول ہنسا مگر میں روتا ہی رہا

اعجاز کوئی نیا دکھایا ہوتا
اس خوب کو خوب تر بنایا ہوتا
قسمت جو مجھے جلانے والی تھی تو کاش
برقِ سرِ طور سے جلایا ہوتا

شکوہ نہ کرو تم اس قدر خواری کا
کچھ غم نہ کیا کرو دل آزاری کا
بیکار نہیں ہیں ظالموں کے یہ ظلم
دیتے ہیں سبق یہ حق کو قہاری کا

بے پردگیوں کا سدِ باب اُٹھے گا
پردہ نہ رہے گا یہ حجاب اُٹھے گا
رفتہ رفتہ وہ دَور آجائے گا
جب چہرۂ ذات سے نقاب اُٹھے گا

کیا قبر میں دادِ عیش کی دیجیے گا
کیا خلد میں جا کے جامِ مے پیجیے گا
پیری آئی اُمیدِ آیندہ گئی
اب بھی نہ کیا عیش تو کب کیجیے گا

اے میرے کریم مجھ پہ رحمت کرنا
پھر میرے سکونِ دل کی صورت کرنا
یہ ہستیِ مُستعار، واپس لے کر
ہستیِ ابد مجھے عنایت کرنا

اہلِ دل کا شریکِ دُنیا ہونا
ہے موجبِ زینتِ تماشا ہونا
موسیٰ کے سبب سے ہے عصا میں تاثیر
دشوار ہے ہر عصا کا موسا ہونا

رہبر ہی ملا نہ کوئی ہمراہ ملا
ثمرہ ہی نہ کوئی حسبِ دلخواہ ملا
ہم دَیر بھی پہنچے اور کعبے بھی گئے
ہم کو تو نہ بُت ملے نہ اللہ ملا

ہر چند کہ دردِ عشق جانکاہ نہ تھا   یہ باعثِ قطعِ عمرِ کوتاہ نہ تھا
لیکن وہ کون تھا کہ مرتے مرتے   یہ دردِ الیم جس کے ہمراہ نہ تھا

صدمے دیے مجکو اور مرا چین لیا   پھر آخرِ کار قتل بھی مجکو کیا
اِس کافرِ عشق سے مسلمانوں نے   افسوس کہ انتقام میرا نہ لیا

جس روز کہ سنگِ کاخِ خلقت رکھا   قدرت نے یہ انتظامِ فطرت رکھا
آلام و غمِ جہان کا مجموعہ کیا   مجموعے کا نام دردِ فرقت رکھا

مٹنا مرا میرے حق میں اچھا بھی ہوا   چھپ جانا ہی باعثِ تماشا بھی ہوا
میں وادیِ نفی میں بشوقِ اثبات   گُم ہو گیا اِس قدر کہ پیدا بھی ہوا

ہوگی خوشی بھی واں جہاں غم ہوگا   نغمہ ہوگا جہاں پہ ماتم ہوگا
شورش کدۂ جہانِ غم میں آسی   ہر زخم کے ساتھ کوئی مرہم ہوگا

اے دل غمِ عشق سے پریشاں ہوجا
بے عافیتی پہ جا کے قرباں ہوجا
بندے کا کبھی خدا تو ہونا معلوم
مجبور یہ کام کر کہ انساں ہوجا

تاراج کیا ہے میں نے گلشن اپنا
برباد کیا ہے میں نے خرمن اپنا
دنیا میں نہیں تھا کوئی دشمن میرا
مجبور ہوا میں آپ دشمن اپنا

جتنی کہ کسی کو عزت و دولت دیگا
جتنی کہ کسی کو جاہ و ثروت دیگا
اُتنی ہی محاسبِ زمانہ اک دن
ذلّت بھی اُسے بجائے عزت دیگا

کعبے میں گئے تو آبِ زمزم پایا
میخانے میں آکے ساغرِ جم پایا
مستانِ خرد رمیدہ نے اے آسی
ہر ایک جگہ پہ ایک محرم پایا

ہے صدق و خلوص ہی میں طاعت کا مزا
نکتہ ہے یہ سُن لیں اس کو سب اہلِ ریا
ڈر کر جو عبادتِ خدا کرتے ہیں
کہتے ہیں مُخنّث اُن کو مردانِ خدا

دل پہلے غمِ وفا میں غم کوش ہوا　　آخر کو وفورِ غم سے بیہوش ہوا
افسوس کہ یہ چراغ روشن آسی　　روغن کی زیادتی سے خاموش ہوا

حل کرتا ہوں یوں میں کارِ مشکل اپنا　　رکھتا ہوں غمِ فنا سے خوش دل اپنا
ہوں بحرِ وجود کا شناور جب سے　　ہر موج کو جانتا ہوں ساحل اپنا

جس وقت گناہ کا ہمیں منصب تھا　　ہر وقت سرور و عیش سے مطلب تھا
اُس وقت کو اب سے کوئی نسبت ہی نہیں　　اک دَور تھا وہ بھی لیکن ایسا کب تھا

روتے ہیں جو بات بات پر اہلِ ریا　　پانی سے یہ دھوتے ہیں سب دل کی خطا
کیا ان کو خبر نہیں کہ فرعونِ پلید　　پانی سے گزر کے آگ میں جا پہنچا

تھا مولویوں کا پہلے میں متوالا　　پھر صوفیوں کو خوب دیکھا بھالا
آخر کو یہی سمجھ میں آیا آسی　　اللہ نہیں سمجھ میں آنے والا

اس جود کو اور اس سخا کو دیکھا
اس لطف کو اور اس عطا کو دیکھا
جس کا بندہ نہیں سوا تیرے کوئی
دیکھا واعظ ترے خدا کو دیکھا

رو رو کے خدا سے کی یہ واعظ نے دعا
ابوابِ کرم کو وا کر اے میرے خدا
اک رند یہ سن کے ہنس کے بولا ظالم
ابوابِ کرم تو وا ہیں پھر دیکھ ذرا

معلوم ہے تجکو اے بخیلوں کے خدا
زر تو نے دیا تو کن کمینوں کو دیا
اب اور تو کیا کہوں میں تجھسے لیکن
ہونا یہ نہ چاہیے تھا جو کچھ کہ ہوا

اے وہ کہ ہمیشہ کام شر ہے تیرا
مجروح جہان میں ہر بشر ہے تیرا
کرتا ہے تو خوب نکتہ چینی لیکن
دنیا کا جو عیب ہے ہنر ہے تیرا

اے بسترِ خاک فرشِ مخمل بن جا
اے اُڑتے ہوئے غبار بادل بن جا
لکھتے ہیں غریب قصدِ مے نوشی کا
اے شاخِ خزاں رسیدہ کونپل بن جا

گانے کے لئے وہی ترانہ رہتا　　سُننے کے لئے وہی فسانہ رہتا
جس میں آتا نہ تھا جدائی کا خیال　　اے کاش ابھی وہی زمانہ رہتا

آرام فلک نے جتنا لوٹا لوٹا　　راحت کا خزانہ جتنا چھوٹا چھوٹا
کافی ہے یہی مگر کہ اب بھی آتی　　ہے پیشِ نظر چمن کا بوٹا بوٹا

اے وہ کہ ترا نصیب سب سے اعلا　　اے وہ کہ تو مرتبے میں سب سے بالا
ایسے بھی ملے ہیں لوگ دنیا میں مجھے　　جن کو نہیں کوئی بھیک دینے والا

کہتے ہیں خدا خلوصِ طاعت لے گا　　تسلیم و توکُّل و قناعت لے گا
جس نے لاکھوں کو مفت شاہی دیدی　　کیا ہم سے بہشت کی قیمت لے گا

اُمید کا سلسلہ مٹا کر چھوڑا　　تسلیم و رضا کی سمت لا کر چھوڑا
مایوسیِ جاوداں کا کیا کہنا ہے　　اس نے مرے دل کو دل بنا کر چھوڑا

آلامِ حیات سے پریشاں تو نہ تھا
اوہامِ ممات سے پشیماں تو نہ تھا
کیوں عشق و وفا نے کر دیا مجکو ہلاک
میں زندگیِ ابد کا خواہاں تو نہ تھا

عصیاں سے اُسی طرح سروکار رہا
توبہ کر لی مگر گنہگار رہا
پہلے جب رند تھا تو بیباک تھا میں
جب زاہد کیا تو سخت مکّار رہا

اک سوزِ خفی نہاں اسی ساز میں تھا
اظہار کا پرتو اسی راز میں تھا
پہنچیں نہیں انتہا پہ نظریں ورنہ
ہنگامۂ آخرت بھی آغاز میں تھا

سُنتا ہوں کہ زہد کا ہے جب سے سودا
اوروں کو وہ دیکھتا نہیں ہے اپنے سوا
کیا زاہد پاشکستۂ حجرۂ زہد
لنگڑا جو ہوا تو ساتھ اندھا بھی ہوا

ردیف باء موحدہ

دن رات وہی شورشِ غم اور وہی تاب
دن رات وہی مصیبتِ رنج و عذاب
رونے میں کہاں سونے کی فرصت آسیؔ
ہے آج خیالِ خواب اک نقش بر آب

اُس نے اُلٹی اگرچہ سو بار نقاب
حائل رہا پھر بھی میری آنکھوں کا حجاب
تھا وصل میں مبتلائے ہجراں یعنی
دریا میں تہیہ دست رہا مثلِ حباب

ہر چند کہ دل ہے آتشِ غم سے کباب
ہر چند کہ دل پہ مفلسی کا ہے عذاب
جمشید سے سلسلہ ملاتا ہے مگر
ٹوٹا ہوا جام جس میں پیتا ہوں شراب

ہستی کو بتا رہے ہیں سب نقش بر آب
عالم کو بتا رہے ہیں سب عالمِ خواب
لیکن یہ خیال سب غلط ہیں آسیؔ
یہ کچھ اور ہی شے ہے یہ نہ دریا نہ سراب

تریاق جھکا ہے آج سم کی جانب
عشرت کا ہے میل رنج و غم کی جانب
اب قصرِ وجود سے ہزاروں جادے
جاتے ہوئے ملتے ہیں عدم کی جانب

روتے ہیں تو غم میں ٹھہرتے ہیں معتوب
اور آہ کریں تو آہ بھی ہے معیوب
جس نے کہ دیا ہے حسنِ یوسفؑ اسکو
دیدے مرے دل کو کاش صبرِ ایوب

مستی ہے شراب بلکہ ہستی ہے شراب
کتنی ارزاں ہے کتنی سستی ہے شراب
ہیں شیشہ بدوش بھورے بھورے بادل
برسات میں رات دن برستی ہے شراب

رندوں کے یہاں صفائے باطن ہی شراب
صوفی کی نظر میں دین کرتی ہی خراب
القصہ یہ وہ عجیب شے ہے جس کا
پینا بھی صواب اور نہ پینا بھی صواب

میخانہ مبارک اے جوانانِ خراب
پیتے رہو تم کہ ہے ابھی عہدِ شباب
جو پیر ہیں اُن سے کہہ دو باہر جائیں
ساقی نے لنڈھا دی اُنکے حصے کی شراب

اے حضرتِ زاہدِ معلّےٰ القاب — دیجے مرے اک سوال کا آپ جواب
دوزخ میں رہیں گے جب شرابی سارے — پھر کون پیے گا جا کے جنت میں شراب

حسن — نظریں ہیں شراب انکا ایما ہے شراب — جلوہ ہے شراب نوکِ زیبا ہے شراب
پینے والوں کے واسطے اے آسی — میخانہ نہیں تمام دنیا ہے شراب

دنیا دوزخ ہے اور علائق ہیں عذاب — ہر پیر و جواں کا اسمیں ہی حال خراب
لیکن واعظ کہ ان کی فطرت ہی جُدا — دوزخ میں بھی دیکھتے ہیں جنت کے خواب

ردیف باء فارسی

کھاتے ہیں ہوا۔ نہ پیٹ بھرتے ہیں آپ — غیبت رندوں کی روز کرتے ہیں آپ
کافی لہ ہے یہ مغفرت کا ساماں واعظ — معلوم ہوا خدا سے ڈرتے ہیں آپ

لہ کیا بات ہے آپ کی جناب واعظ

ردیف تاء فوقانی

جو گور پرستی میں ہوئے ہیں سرمست
وہ دین کی راہ سے ہیں گمرہ یکدست
اللہ نے ہم میں ان میں رکھا ہے فرق
ہم زندہ پرست ہیں وہ سب مُردہ پرست

انساں کے لیے یہ عمرِ فانی ہے موت
انساں کے لئے یہ زندگانی ہے موت
ڈرتے ہیں جوانی میں عبث مرنے سے
سو موت کی ایک یہ جوانی ہے موت

چھائی ہوئی ہے زمانے بھر میں وحدت
پھر کس کی اطاعت اور کیسی طاعت
آسیؔ جو حقیقت میں حقیقت ہے کچھ
تو وہم ہی وہم ہے خیالِ کثرت

کرتا ہے قبول اب ہمیں نیک نہ زشت
دیتا ہے جگہ ہمیں نہ کعبہ نہ کنشت
جو خانہ خرابِ عاشقی ہیں آسیؔ
وہ لائقِ دوزخ ہیں نہ شایانِ بہشت

کہتے ہیں تمام ہمنوائے فقر
کر صبر ہے گر تو مبتلائے فقر
ہم اس کو بھی آزما چکے ہیں آسی
ہوتی نہیں صبر سے دوائے فقر

اے محوِ خیال کوئی دشمن ہے نہ دوست
سب تیرا گمان ہے کہیں مغز نہ پوست
نیرنگِ نظر ہیں سب نقوشِ ظاہر
عالم ہمہ زوست بلکہ عالم ہمہ اوست

کبتک یہ غرورِ مال وجاہ و دولت
کبتک یہ سرورِ عیش و ذوقِ راحت
آسان نہیں ہے ابنِ آدم ہونا
آخر تجھے چھوڑنا پڑے گی جنت

بیکار ہے فکرِ مسجد و دیر و کنشت
ہے شوقِ بہشت تو بدلو اپنی سرشت
یہ نغمہ و مے کے بھیس میں ملتا ہے
رنگینیِ زندگی کا شیدا ہے بہشت

ردیف ثاء مثلثہ

در اصل ہوا ہے اب یہ قصا حادث
کیسا کوئی قدیم کیسا حادث
تھی علمِ الٰہی میں ازل سے موجود
گویا کہ قدیم سے ہے دنیا حادث

ردیف جیم تازی

ہے عالمِ عافیت جو نذرِ تاراج
دنیا میں مری نہیں مسرت کا رواج
حد کر دے کرم کی اپنے مجھ پر یارب
جتنا تو غنی ہے میں ہوں اُتنا محتاج

ردیف جیم فارسی

یہ غم بھی ہے ہیچ شادمانی بھی ہیچ
افلاس بھی ہیچ کامرانی بھی ہیچ
سرمایۂ عمر نوجوانی ہے۔ مگر
عبرت کہتی ہے نوجوانی بھی ہیچ

افسردہ کسے آ گئے شورِ ہستی ہے ہیچ
ہر فکرِ بلندی اور پستی ہے ہیچ

جو ہیچ پرست ہیں جہاں میں آسیؔ
اُن کے لیے یہ خدا پرستی ہے ہیچ

ردیف حاء حطی

ہے غم کا سکون بیقراری کی طرح
ہے عشق کا ہر غرور خواری کی طرح

آتی نہیں پاس بھی حدودِ دل کے
اب عقل ہے مجرمِ فراری کی طرح

ردیف دال مہملہ

کوئی گُلِ عیش چُن لیا ہو شاید
مشکیں نفس اُس سے ہو گیا ہو شاید

سنتا ہوں کہ کچھ روز جیا تھا میں بھی
کچھ یاد نہیں یہی ہوا ہو شاید

ہے عالمِ فانی میں فقط قیدِ وجود
اور عالمِ باقی میں نمایش کے حدود

تم عبد جو سنتے ہو یہ فرضی ہے نام
در اصل ہے یہ کہ ہے فقط وہ معبود

ہوتی ہے خوشی کی صرف غم سے تائید
بعدِ رمضاں ہمیشہ آتی ہے عید
ہوتا نہ یہی اگر تو ہوتے کیونکر
کفّار کے ہاتھ سے مسلمان شہید

ہے گرچہ نظر کے سامنے نقشِ وجود
پوشیدہ نہیں ہے ہم سے کچھ غیب و شہود
حاصل نہیں کچھ بھی لیکن اس حاصل سے
معلوم نہیں ہے کچھ بھی حسبِ مقصود

کیوں ماہِ صیام کی رکھیں ہم اُمید
کس واسطے کھینچیں ہم یہ تصدیعِ مزید
شوال کا پہلا روز کیسا آسی
جب اُن سے گلے ملے اُسی روز ہے عید ملیں

یہ سطحِ زمین اور یہ چرخِ کبود
یہ کوہ و شجر یہ عالمِ ہست و بود
ممکن نہیں ان کو پائداری ہونا
پانی پہ بنے ہوئے ہیں سب نقشِ وجود

دیتا نہیں ایک جو خلافِ امید
یہ لطف ہے اسکی پست فطرت سے بعید
اندازۂ شادی والم رکھتا ہے
پیمانۂ آسماں ہیں ماہ و خورشید

رکھتے ہیں ہمیشہ معصیت سے دل شاد ۔۔۔ کرتے ہیں خدا کو وقت پڑنے پر یاد
دنیا چھوٹی تو چھوڑتے ہیں دُنیا ۔۔۔ اُڑتے طائر کو کر رہے ہیں آزاد

جب حشر میں جاکے جمع ہونگے زن و مرد ۔۔۔ اور ہاتھ میں سب کے ہوگی اعمال کی فرد
میں بحرِ حساب لیکے آؤں گا وہاں ۔۔۔ تیرا غم عشق اور اپنا رُخِ زرد

کیا قسمتِ واژگوں ہے دشوار پسند ۔۔۔ ہے سب کے گلے میں رنجِ دنیا کی کمند
لے دیکھ غنی ہیں سب سے بہتر لیکن ۔۔۔ آنانکہ غنی تراند محتاج تراند

اللہ غفور پاک ستارِ ودود ۔۔۔ دنیا میں بھی اور حشر میں بھی موجود
ڈرنا ہے اگر تو اس سے ہر وقت ڈرو ۔۔۔ اک روز کے واسطے ہے ڈرنا بیسود

ردیف راء مہملہ

اے زاہدِ خود نما ذرا خوف تو کر
اتنا تو نہو سر کو جھکا کر خود سر
ہنستا ہے زمانہ اور روتی ہے عمر
اس تیری نماز اور ترے روزے پر

جاتا ہوں تری گلی سے زاری لیکر
آشفتہ سری و بے قراری لیکر
دل مفت نہیں دیا ہے تجکو میں نے
جاتا ہوں میں تیری یادگاری لیکر

اک محفلِ عیش میں ہوا میرا گزر
دیکھا اک خشک پھول کو مجمر پر
پوچھا میں نے کہ کیوں جلاتے ہیں تجھے
بولا کہ چمن میں ہنس لیا تھا دم بھر

ہے ہستیٔ چند روزہ کیا مایۂ شر
اس رنج سے بہہ گیا جگر خوں ہوکر
دنیا کے قیام میں بھی لاکھوں آفات
اور اس سے زیادہ سخت عقبیٰ کا سفر

بیکار ہے وہم قرب ساحل کا سرور
بیکار ہے عالم مسرت کا ظہور
دریائے بلا میں جوش طوفاں نہ سہی
یہ دل ہے اگر تو ناؤ ڈوبے گی ضرور

اے واعظ خوش بیان مجھے تنگ نہ کر
باتوں کا تری نہیں مرے دل پہ اثر
آنے والا نہ کوئی جانے والا
پھر کس سے سنی بہشت و دوزخ کی خبر

تسبیح اِدھر ہے اور زنّار اُدھر
کعبہ ہے ادھر تو اُس طرف ہے مندر
اے بے خبرِ مآلِ سیرِ ہستی
جانا ہے کسی طرف تو جا دیر نہ کر

بیشک ہے خلد میں مے صاف و طہور
لیکن نہیں ہوتا اُس سے رندوں کو سرور
شکوہ کس بات کا جنابِ واعظ
تم بھی مجبور اور وہ بھی معذور

اک دوست جو کر گیا تھا دنیا سے سفر
روتا تھا میں اُس کی قبر پر جا کر
اک دن یہ صدا سنی کہ اے دشمنِ ہوش
اوروں کے لئے نہ رو اب اپنا غم کر

یہ شام یہ صبح یہ خوشی یہ آزار
یہ کعبہ یہ دیر یہ خصومت یہ پیار
سب درج ہیں یوں صحیفۂ قدرت میں
جیسے کسی مثنوی کے موزوں اشعار

محجوب خزاں گئی چمن سے باہر
بلبل ہوئی خاص انجمن سے باہر
آتے ہی بہار غایتِ مستی میں
گل ہو گئے اپنے پیرہن سے باہر

اس گنبدِ بے در سے نکلنا ہے ضرور
اک روز آتشِ بیکسی سے جلنا ہے ضرور
جس راہ سے جی چرا رہے ہو آسی
اُس راہ میں ایک روز چلنا ہے ضرور

پوشیدہ ہیں ذات میں مری میرے ہنر
غیروں کو نہیں ہے کوئی بھی اسکی خبر
میں آپ ہی اپنی شمع کا ہوں فانوس
معمورِ تجلیات ہوں میں مثلِ گہر

دنیا میں جہاں جہاں بھی کی ہم نے سیر
لڑتے ہوئے دیکھے ساکنِ کعبہ و دیر
کوئی نہیں صلح کا کرانے والا
ہو جا اے عشق تو ہی ثالث بالخیر

سانسوں کی ہوا پہ ہے فقط اک تعمیر　　پانی پہ کھنچی ہوئی ہے عکسی تصویر
تم زیست کو خواب سے نہ دینا تشبیہ　　ہے خواب تو خواب کی کہاں ہے تعبیر

پھر دردِ وفا کی اور کیا ہو تفسیر　　جب میرا سکوت خود بنا ہے تقریر
قصّہ یہ نہیں کہ اس کو دوں طولِ فضول　　یہ خواب نہیں کہ اس کی ہو کچھ تعبیر

اب نشہ نہیں خمار باقی ہے مگر　　دل بس بھی گیا فشار باقی ہے مگر
گزری شبِ ہجر صبحِ محشر آئی　　افسانۂ جورِ یار باقی ہے مگر

کیا سر کو جھکا رہا ہے تو اے مغرور　　جو سر میں ہے اسکو پہلے سر سے کر دُور
ورنہ تری وہ مثال ہو جائے گی　　دریا میں حباب جیسے دریا سے دُور

جیسے کہ جُدا ہیں اہلِ دین و کُفّار　　جیسے کہ جُدا ہے تابشِ نور و شرار
ایسے ہی نہیں شہید و عاشق یکساں　　اک کشتۂ دوست اک قتیلِ اغیار

دنیا بھی عجیب طرح کا ہے گلزار
ہر پھول کے ساتھ میں لگا ہے اک خار
کھولی ہے یہ شمع نے حقیقت ہم پر
جو دُور سے نور ہے وہی پاس سے نار

اے خالقِ خیر و شر خدائے غفّار
ہم کیوں ہوئے جُرم و معصیت پر ناچار
تکلیفِ حیات اگر نہ دیتا ہم کو
پھر بھی ترا عفو تو نہ رہتا بےکار

اک سمت نظر فریبیِ جرم و قصور
اک سمت شرابِ طاعتِ حق کا سرور
یہ دام گہِ خیال یعنی دُنیا
آسی ہمیں اک نہ اک میں پھانسے گی ضرور

بھرتا ہوں گلوں سے اپنا دامن اکبار
پیتا ہوں شراب کے پیالے دو چار
اس وقت بہار ہے مگر اے آسی
ممکن ہے کہ پھر نہ آئے دنیا میں بہار

دیکھا تو نے کہ صفحۂ گردوں پر
دن کو خورشید ہے تو شب کو ہے قمر
مطلب یہ ہے کہ تا نظامِ ہستی
ہرگز ترے ہاتھ سے نہ چھوٹے ساغر

ہے بیکدہ جہان کی ہر شئے مضطر
جمتی ہی نہیں کسی طرح اپنی نظر
سو مرتبہ اس میں بن کے خم ٹوٹے ہیں
سو مرتبہ ٹوٹ کر بنے ہیں ساغر

جوشِ گُل و لالہ ساتھ لائے گی بہار
ویرانے کو پھر چمن بنائے گی بہار
گھبرا کے نہ توڑ شیشہ و ساغر کو
ڈھونڈیگا انھیں کو پھر جب آئیگی بہار

دل میں تپِ عشق سے تعب پیدا کر
آئینِ وفا میں رہِ ادب پیدا کر
جب کچھ بھی نہ بن پڑے تو کر خوب گناہ
رحمت کا غرض کوئی سبب پیدا کر

باتوں میں تو اختیار شیرینی کر
اظہارِ نیاز و عجز و مسکینی کر
خواہش ہو جو آنکھ میں جگہ پانے کی
اے مردمِ دیدہ ترکِ خود بینی کر

ردیف راے ثقیلہ

اس ذکرِ خوارق و کرامات کو چھوڑ
اس فخر کو چھوڑ اس مباہات کو چھوڑ
باتیں کرنا ہیں گر تجھے اے زاہد
کچھ اور ہی ذکر کر خرافات کو چھوڑ

آزادیِ دل کو بندِ غم میں نہ جکڑ
ناصح کی نہ مان بات رندوں سے نہ لڑ
دنیا ہے یہ سب ہوا ہی کرتا ہے یہاں
پینا ہے تو پی فضول جھگڑوں میں نہ پڑ

رُخ زہد و صلاح و خیر و تقویٰ سے بھی موڑ
اور رندی و خود پسندیِ دل کو بھی چھوڑ
آزادی و خوش دلی کے معنی ہیں یہی
توبہ کو بھی توڑ اور ساغر کو بھی توڑ

ردیف زائے معجمہ

سے شادی کو ممکن ہی نہیں ہے غم کو شادی سے گریز
فطرت نے کیا ہے ان کو باہم آمیز
سمجھا ہی نہیں یہ راز تو نے آسی
در اصل ہیں ایک چیز تمیز و جمیز

شق ہوگا یہ پردۂ دخانی اک روز
ٹوٹے گا طلسم آسمانی اک روز
بدلے گی ضرور یہ ہوائے امکاں
ڈوبے گا جہاز بادبانی اک روز

آلام عذاب دیکھتے ہیں ہر روز
اوہام صواب دیکھتے ہیں ہر روز
ہستی کو سنا گیا ہے اک خوابِ طویل
ہم خواب میں خواب دیکھتے ہیں ہر روز

میخانۂ دہر کے نئے ہیں انداز
ہر فرقے کے واسطے جدا ہے اک راز
زاہد اسے جانتا ہے اک لغزشِ پا
ساقی جسے مانتا ہے مستوں کی نماز

ایمان نہیں ہے کفر پنہاں ہے ہنوز
جاں خاک ہوئی مگر غمِ جاں ہے ہنوز
لیکن اس بات کا تعجب کیا ہے
آدم نہیں اور جہاں میں شیطاں ہے ہنوز

کس نشے کا یہ خمار باقی ہے ہنوز
کس وعدے کا اعتبار باقی ہے ہنوز
آنکھیں جو کھُلی ہیں بعد مرنے کے مری
کیا زیست کا انتظار باقی ہے ہنوز

ہرگز نہ سمجھ اسے تو اپنا دِلسوز
ہرگز نہیں یہ بہار ہستی افروز
یہ آب و گِل اور یہ باد و آتش تجھ سے
پھر چھینیں گے اپنی طاقتوں کو اک روز

ردیف سین مہملہ

ظالم دمِ نزع بھی نہ آیا افسوس
افسانۂ غم نہ سننے پایا افسوس
تھی جذبۂ دل سے ہم کو اُمید آنے کی
افسوس عجب فریب کھایا افسوس

یُیں یبس کے ہوا حنا کی صورت پابوس
امید فزوں ہوئی ہے ہو کر مایوس

ہوں باغ جہاں میں بید مجنوں کی طرح
ہوتی ہے مرے یہاں ترقی معکوس

دو دن کی ہے رونقِ گلستاں افسوس
دو دن کی ہے بلبلِ غزل خواں افسوس

کیا آئی تھی تو دلوں سے جانے کیلئے
اے آرزوئے وداعِ ساماں افسوس

ردیف شین معجمہ

دنیا ہے گنہ کی عبث پیدائیش
ممکن نہیں اس سے جرم کی افزائیش

اللہ ہے نورِ دو جہاں اے آسی
اب ظلمتِ کفر کی کہاں گنجائیش

باقی نہیں عقل و ہوش کی گنجائیش
ہرگز نہیں اس میں وسعتِ آرائیش

دیکھتی ہے جہاں سے میری حیرانیٔ عشق
آئینے کی طرح اک نظر کی خواہش

ردیف صاد مہملہ

سرسبز نہو سکے گا یہ دانۂ حرص
معمور نہ ہو سکے گا پیمانۂ حرص

اک ظرف شکستہ میں کسے خالی ہوگا
جتنا کہ بھرے گا کوئی پیمانۂ حرص

ردیف ضاد معجمہ

سو سال کرے تو شادمانی بالفرض
سو سال کرے تو کامرانی بالفرض

مرگ و پیری سے پھر بھی ہوگا دوچار
سو سال بھی ہو جو زندگانی بالفرض

ردیف عین مہملہ

پیری میں نہیں ہے ماؤ من کا موقع
باقی نہیں کسب علم و فن کا موقع

اُس وقت لباس قطع کرنا کیسا
جس وقت کہ آگیا کفن کا موقع

داغ انداز خود نمائی ہے شمع
محفل کو بھڑک دکھانے آئی ہے شمع

دو چار گھڑی جلے گی اور چل دے گی
اک سوزشِ ناتمام لائی ہے شمع

ردیف غین معجمہ

گو رنجِ فراق سے نہیں دل کو فراغ
پھر بھی سب کچھ ہے فرقتِ دوست کا داغ

ہر چند وہ روشنی نہیں ہے لیکن
ہے رات کو جانشین سورج کا چراغ

ردیف فا

جب کشتیِ عمر آئی ساحل کی طرف
اور پہنچی حیات اپنی منزل کی طرف

کافورِ کفن سے ہو گئے بال سفید
بالوں سے سیاہی آ گئی دل کی طرف

ردیف قاف

ناواقفِ دردورنجِ ہستی ہے عشق
استادِ رموزِ غم پرستی ہے عشق
یہ نشۂ شراب میں کہاں ہوتا ہے
سچ پوچھو تو کیمیائے مستی ہے عشق

بھڑکی ہے کچھ ایسی آتشِ تیزِ نفاق
ہیں رنج وبلائے ہمدگر کے مشتاق
ہم پھول ہیں گلشنِ جہاں کے لیکن
ہیں باعثِ برہمی ہمارے اوراق

آنے سے ترے ہوا ہے دل شادِ اے عشق
اب تیرے سوا نہیں کوئی یاد اے عشق
دی مجکو بلائے دین و دنیا سے نجات
فریاد اے عشق آہ فریاد اے عشق

ہے دفترِ معرفت کی تعلیمِ اَدَق
ممکن نہیں ایک عمر میں ایک سبق
مت دیکھ زمین وآسماں کی جانب
یہ ایک ورق ہے اور وہ ایک ورق

ردیف کافِ تازی

پہلے سے جو تھی وہی ہُوا ہے ابتک
جو زنگ جما تھا وہ جما ہے ابتک
مدت سے شرابِ خونِ دل پیتا ہوں
پیمانۂ غم مگر بھرا ہے ابتک

جاری ہے مری شرابخواری ابتک
رود اور سرود سے ہے یاری ابتک
گو بال سفید ہیں مگر باقی ہے
دل میں ہوسِ سیاہ کاری ابتک

محفوظ ہیں عشق کے سرشتے ابتک
منقوش ہیں لاکھوں نقش اُسکے ابتک
ہے طور جلا ہوا جہاں میں موجود
لٹکے ہیں کنوئیں میں دو فرشتے ابتک

کیا سمجھے رموز اسکے فہم و ادراک
کیا اس سے نقائصِ معانی ہوں پاک
تارے نہیں بلکہ ہیں یہ شک کے نقطے
ہے سخت غلط صحیفۂ ہفت افلاک

جامِ مے معرفت نہ پی اے بیباک
ہے دور میں اسکے گردشِ ہفت افلاک
یکساں نہیں رہتی خاصیت اسکی کبھی
ہے نشے میں سم اگر تو سم میں تریاک

تشخیصِ وفا میں دولت اور خاک ہے ایک
یعنی دل شاد و جان غمناک ہے ایک
ہے اسکی پسند ساری دنیا سے جدا
ظالم کی نظر میں زہر و تریاک ہے ایک

ہیں اصل میں زہر ہم بظاہر تریاک
جی خوش ہے گنہ سے اور چہرہ غمناک
ہے ظاہر حال اور تو باطن اور
کپڑے ہیں تمام پاک دل ہے ناپاک

ظالم دشمن بلائے جان دونوں ایک
کافر غدار بدگمان دونوں ایک
ہو جائینگے شورِ حشر اُٹھانے کیلئے
اک دن یہ زمین و آسمان دونوں ایک

پہنچا نہیں کوئی سرحدِ مطلب تک
عُقدہ یہ کھلا نہیں کسی پر اب تک
تو عمر گزار اپنی یہ فکر نہ کر
دنیا کب سے ہے اور رہے گی کبتک

آسی بس کر سخن طرازی کب تک
افسوں گری اور فسانہ سازی کب تک

اظہارِ حقائق اور سخن گوئی میں
اے مردِ خدا خیال بازی کب تک

ردیف کافِ فارسی

امکان کو اب وجوب کہتے ہیں لوگ
جوہر ہیں مگر عیوب کہتے ہیں لوگ

خاموش رہو ہوا کے رُخ کو دیکھو
جو کچھ کہتے ہیں خوب کہتے ہیں لوگ

ردیف لام

ساقی ہے نہ ساغر ہی نہ مینا ہے نہ مُل
مطرب ہے نہ نغمہ ہی نہ بلبل ہے نہ گل

سمجھو انھیں صرف سیمیا کی سی نمود
یا سحر وجود جانو ان کو بالکل

نیکی کی کبھی بدی سے ملتی ہے سبیل
فتنے کبھی عافیت کی ہوتے ہیں دلیل
زنداں میں نہاں ہے اوجِ جاہِ یوسفؑ
نمرود کی آگ میں ہے گلزارِ خلیلؑ

اے مستِ شباب سرخوشِ حالِ وصال
یہ عیش کا دَور ہے نہ کر ذکرِ ملال
جب وقت پڑے تو فکر کرنا اس کی
آغاز میں بدنما ہیں افکارِ مآل

گُل بن نہ سکے تو داغ سے لالہ ہو دل
جب ماہ نہ ہو تو ماہ کا ہالہ ہو دل
دنیا ہے نظام کی ضرورت ہے یہاں
موتی نہ بنا تو صورتِ ژالہ ہو دل

ہے ہجر کی شکل میں نمودار وصال
بدلے ہوئے ہیں زمانے بھر کے احوال
اب دوست ہیں مثلِ مُہرہ ہائے شطرنج
یعنی کہ ہر ایک کی جُدا ہی اک چال

غالب تھی عروجِ عیش پر فکرِ زوال
حاوی تھا حال پر عزمِ استقبال
دیروز کے ساتھ تھا خیالِ امروز
امروز کے ساتھ میں ہے فردا کا خیال

بگڑے نہ غریب بادہ نوشوں کا بھی حال
اور حکم بھی ہو شیخ و واعظوں کے پامال
اب بھی جو حرام کر نے والا مے کو
عقبیٰ میں حرام کر دے دنیا میں حلال

زندہ ہے تو زندگی سے رکھ اپنا میل
تحقیقِ حیات کا یہاں کھیل نہ کھیل
مے پی لے یہ پوچھنے سے کیا مطلب ہے
انگور کا پیڑ تھا کہ انگور کی بیل

عقبیٰ کو نہ جان اپنی دنیا کا بدل
جو آج ہے بات غیر ممکن ہے وہ کل
دنیا میں عمل ہے اور نہیں کوئی حساب
عقبیٰ میں حساب ہے نہیں کوئی عمل

دنیا گزران ہے غور سے دیکھ سنبھل
دم بھر میں ابد سے جا کے ملتا ہے ازل
دشوار قیامِ زندگانی دشوار
کل آج ہوئی تو آج ہو جائے گی کل

پیری سے گئی شباب کی شکل بدل
اب ہوش و حواس ہو رہے ہیں مختل
غافل نہیں پھر بھی حسن سے عشق مرا
منظورِ نظر ہے آج بھی حسنِ عمل

ردیف میم

ہے کون و فساد سے زمانے کا نظام — ہر صبح کے ساتھ میں لگی ہے اک شام
جھونکا ہے ہوا کا زندگی، اے غافل — جھپکی اِدھر آنکھ اور اُدھر کام تمام

نکتہ ہے یہ ٹھیک اس میں کچھ بیش نہ کم — اطلاق ہے اس کا سب پہ وہ تم ہو کہ ہم
ہستی سے تمھاری خود فنا ہے ظاہر — اے مثلِ سراب نقشبندانِ عدم

وہ پاک خدا کہ جس کے احساں ہیں تمام — وہ پاک خدا کہ جس کے الطاف ہیں عام
کر کر کے بیان اس کی قہاری کا — جی بھر کے کیا ہے واعظوں نے بدنام

حیرت ہے مجھے یہ کوئی شادی ہو کہ غم — ہیں دونوں طرح کے جس میں اسباب بہم
ہم ایسے وجود کو کہیں کیا آخر — جس کے کہ اِدھر اُدھر ہے موجِ عدم

ہستی کے سبب سے شق ہے یہ قلبِ دو نیم — ہستی کے سبب سے ہے یہ امید یہ بیم
جب باغ سے آشیاں اُٹھا لیں گے ہم — پھر اس میں چلے سموم یا بادِ نسیم

دارا ہے نہ خسرو ہے نہ کاؤس نہ جم — وہ سام و نریماں ہے نہ زال و رستم
کسریٰ ہے کہیں نہ قصرِ کسریٰ کا نشاں — ہے پھر بھی بنائے آسماں مستحکم

غربت کے اُٹھا رہے ہیں ہم رنج و الم — صحرائے تلاش میں لرزتے ہیں قدم
رہتے ہیں مثالِ آسیا سرگرداں — حالانکہ ہے یہ مسافت اک ہاتھ سے کم

کچھ کر نہ سکے گی تیری سعیِ ناکام — وا ہو نہ سکے گا عقدۂ دورِ انام
ڈر مشہدِ دہر سے کہ اس میں اکثر — قاتل کے عوض ہوئے ہیں بسمل بدنام

دوریِ حبیب ہے تو کیا کر لیں ہم — دشمن جو نصیب ہے تو کیا کر لیں ہم
ہے اُس کے یہاں بھی حسن والوں کی قدر — اللہ رقیب ہے تو کیا کر لیں ہم

نغمہ بھی حرام نوحہ خوانی بھی حرام
مے ہی نہیں مستیِ جوانی بھی حرام
اس جینے سے فائدہ ہی کیا ہے آسی
کہدے کوئی کاش زندگانی بھی حرام

کیا ڈھونڈھ رہا ہے کیمیا کو ہر دم
آ، نسخۂ کیمیا بتائیں تجھے ہم
نسخہ یہ ہے کہ ان کو تبدیل نہ کر
تقدیر میں لکھ گئے ہیں جو راحت و غم

دنیائے دنی کے ہیں تمام الٹے کام
یاں صبح کی جا دکھائی دیتی ہے شام
کہتے ہیں شراب کو سبھی دخترِ رز
مادر ہے حلال یعنی دختر ہے حرام

انگور کی ہے شراب دخترِ گلفام
لیکن انگور نیک یہ ہے بدنام
واعظ کے مذاق نے کیا ماں کو پسند
کرنا تھا اگر تو کرتا لڑکی سے حرام

ردیف نون

کچھ بھی نہیں ہیں یہ کفر و ایماں دونوں
کچھ بھی نہیں یہ گبر و مسلماں دونوں

جب رازِ حقیقت سے اُٹھایا پردہ
رونے لگے ہو ہو کے پشیماں دونوں

ہیں جاہلِ محض گرچہ با عرفاں ہیں
بچے ہیں ہنوز گو مطوّل خواں ہیں

آموختے کے سوا نہیں آتا کچھ
یعنی دانا تو ہیں مگر ناداں ہیں

ادنیٰ ہیں اگرچہ ہم بہت اعلیٰ ہیں
پتھر ہیں دراصل ظاہرا ہیرا ہیں

اک حرف بجز نام کے معلوم نہیں
خاتم ہیں کہ صرف مظہرِ اسما ہیں

اب علم و ہنر سے سخت حیراں ہوں میں
حیراں ہی نہیں فقط پریشاں ہوں میں

پرساں نہیں اس جنس کا دنیا میں کوئی
آئینہ فروشِ شہرِ کوراں ہوں میں

شایانِ ملامتِ دو عالم ہم ہیں	مستوجبِ طعنہائے بہیم ہم ہیں
رکھتے ہیں چراغِ کعبہ بتخانے میں	بدنام کُنِ دودۂ عالم ہم ہیں

بتخانہ ہماری بلک محمود نہیں	بُت زیبِ نظر ہیں دل کے مقصود نہیں
میں روز بتوں سے جا کے کہہ آتا ہوں	تم عبد ہو میرے میرے معبود نہیں

ساماں راحت کا کوئی موجود نہیں	اک چیز بھی پاس حسبِ مقصود نہیں
لیکن یہ خیال اک بہشت دل ہے	اُمید و خیالِ دوست مفقود نہیں

ہم منکرِ اولیا و اخیار نہیں	ہم اُن سے کشیدہ مثلِ اشرار نہیں
لیکن خالق کو چھوڑ کر اے آسیؔ	بندوں سے مدد کے ہم طلبگار نہیں

افسانۂ شوق متصل کہتا ہوں	اک شور میں کر کے مشتمل کہتا ہوں
سمجھا نہیں قافلہ مرے مقصد کو	میں بانگِ جرس ہوں دردِ دل کہتا ہوں

عصیاں میں زمانے بھر یہ غالب ہوں میں — شر سے یک جان اور دو قالب ہوں میں
وجہ بخشش نہیں ہے کوئی یارب — آمرزشِ بے سبب کا طالب ہوں میں

اس سے پہلے کہ تیرے دل کو توڑیں — اس سے پہلے کہ باگ تجھسے موڑیں
لوگوں کو تو خود ہی چھوڑ دے اے آسی — اس سے پہلے کہ لوگ تجھکو چھوڑیں

مامونِ بلا ہوں اور خطر میں ہوں میں — منزل پہ پہنچ کے رہگزر میں ہوں میں
ہوں رشتۂ تسبیح کا دانہ گویا — اپنے گھر میں ہوں اور سفر میں ہوں میں

قدرت کا تری بندۂ دیرینہ ہوں میں — اور تیرے کمالات کا گنجینہ ہوں میں
تو مجھسے ہے ظاہر اور میں تجھسے ہوں عیاں — تو آئینہ میرا ترا آئینہ ہوں میں

تدبیریں کبھی مفید ہوتی بھی ہیں — اکثر یہ ترا وقت کھوتی بھی ہیں
دلتنگ نہ ہو کبھی تو ان سے آسی — دریا میں حباب بھی ہیں موتی بھی ہیں

ہمت جو ذرا قدم بڑھائے تو چلیں
یہ درد یہ اضطراب جائے تو چلیں
ہستی ہے فقط غبارِ راہِ مقصود
دم بھر یہ غبار بیٹھ جائے تو چلیں

بے کلفتِ دل فشار میں رہتا ہوں
بے نشۂ مے خمار میں رہتا ہوں
طاعت نہیں اور امید آمرزش ہے
بے وعدے کے انتظار میں رہتا ہوں

ہستی و فنا کے غم سے بالا ہوں میں
موت اور حیات سے مبرّا ہوں میں
خود اپنے عرض کے واسطے ہوں جوہر
دانے میں شجر میں دانا ہوں میں

میں روز سحر کو سینہ شق ہوتا ہوں
اور شام کو خوں چوں شفق روتا ہوں
اس ہستیِ بے ثبات کے غم میں مدام
شبنم کی طرح عرق عرق ہوتا ہوں

وہ سر بھی نہیں وہ جوشِ سودا بھی نہیں
وہ یاس وہ دردِ روح فرسا بھی نہیں
جتنی کہ خرابیاں تھیں سب ہم سے تھیں
دنیا میں نہیں ہیں ہم تو دنیا بھی نہیں

حیراں بھی ہیں مست بھی ہیں انجان بھی ہیں
عاقل بھی ہیں عالم بھی ہیں نادان بھی ہیں
نیرنگیِ جلوہ ہائے اصنام کو دیکھ
بتخانے میں آج کچھ مسلمان بھی ہیں

ہنستے ہوئے آئیں اور رُلاتے جائیں
دلداری کو آئیں دل دُکھاتے جائیں
احباب کی شان ہے یہ آسیؔ صاحب
ایک ایک کو آپ آزماتے جائیں

ہوں جمع بظاہر اور پگھلتا ہوں میں
افسردہ ہوا ہوں اور جلتا ہوں میں
میں عمرِ روانِ شمع ہوں اے آسیؔ
استادہ ہوں اس طرح کہ چلتا ہوں میں

اس باغِ جہاں میں گل کھلے ہیں لاکھوں
صدموں سے یہاں کے دل ملے ہیں لاکھوں
ایک اپنے ہی دل کو تو لئے پھرتا ہے
ایسے ایسے مجھے ملے ہیں لاکھوں

شمعیں جلتی ہیں اور بجھ جاتی ہیں
کلیاں کھلتی ہیں اور مرجھاتی ہیں
لیکن یہ بات راز ہی ہے اب تک
فطرت کا فریب سب یہ کیوں کھاتی ہیں

مطلوب ہے جو مجھے وہ معدوم نہیں — میں دولتِ آگہی سے محروم نہیں
آشفتگیِ خیال کو کیا کیجے — معلوم ہے جو وہ اب بھی معلوم نہیں

دامانِ ثباتِ عیش سیتا ہوں میں — ملتی ہے جہاں وہیں سے پیتا ہوں میں
یہ بھی معلوم ہے کہ مرنا ہے ضرور — یہ بھی مشہور ہے کہ جیتا ہوں میں

چشمے دودھ اور شہد کے بہتے ہیں — کھاتے پیتے ہیں جو وہاں رہتے ہیں
واعظ نے بتائی ہے یہ شانِ جنت — رندوں سے بھی پوچھ لو وہ کیا کہتے ہیں

ہرگز نہ کہو کہ کوئی عاقل ہی نہیں — جاہل ہیں تمام کوئی کامل ہی نہیں
اپنے پہ قیاس دوسروں کا نہ کرو — کیا تم جو نہیں تو کوئی عاقل ہی نہیں

آئین و طریق اب وہ یکمشت نہیں — جن کی طرف اک زمانے کی پشت نہیں
آتشکدے اب بھی سیکڑوں ہیں روشن — لیکن کہیں کوئی آج زردشت نہیں

زندہ رہے ہم اگرچہ مرنا تھا ہمیں
ہنستے رہے گرچہ نالہ کرنا تھا ہمیں
یہ رنج نہیں کہ کردنی کچھ نہ کیا
غم یہ ہے کیا وہ جو نہ کرنا تھا ہمیں

اکثر سمجھا کہ فخرِ ایام ہوں میں
اکثر سوچا کہ اک خوش انجام ہوں میں
اب راز کھلا تو یہ کھلا اے آسی
کچھ بھی نہیں کیمیائے اوہام ہوں میں

تقدیر نے جس قدر جفائیں کی ہیں
فطرت نے اسی قدر وفائیں کی ہیں
سمجھی شاید وہ گناہ سمجھے جائیں آسی
گھبرا گھبرا کے جو دعائیں کی ہیں

آئینۂ بزمِ نکتہ دانی ہوں میں
اور بلبلِ باغِ خوش بیانی ہوں میں
القصّہ صفات مجھ میں سب ہیں موجود
اتنی سی کسر ہے بس کہ فانی ہوں میں

تقدیر اب اور آزمائیں گے کہاں
آرام یہاں نہیں تو اور پائینگے کہاں
دنیا ہی میں ہر طرح سے رہنا ہوگا
دنیا سے نکل کے آپ جائینگے کہاں

دنیا ہے بلا تو کیوں پھنسا ہی اسمیں — اس درجہ تو محو کیوں ہوا ہی اسمیں
آرام کا نام ہے بہشت اے غافل — آرام نہیں تو اور کیا ہی اسمیں

سننا ہے نہ کچھ کسی سے کہنا ہے ہمیں — ہر رنجِ وجود اب تو سہنا ہے ہمیں
یا خدمتِ خلق یا بسجودِ خالق — ہر طرح غرض غلام رہنا ہے ہمیں

ہستی نے کہا غمِ فنا دوں گی میں — دنیا نے کہا کہ دل بٹھا دوں گی میں
انسان کو سُن کے یہ بڑا رنج ہوا — غفلت نے کہا کہ سب بھلا دوں گی میں

اس باغِ جہاں میں نکتہ پرداز نہیں — اس بزم میں کوئی محرمِ راز نہیں
مجبور زبان بند کرلی ہم نے — کیا فائدہ جب کوئی ہم آواز نہیں

جمعیتِ دل کو برہمی کہتے ہیں — افزونیِ عیش کو کمی کہتے ہیں غمی
ہشیار رہو سمجھ کے کچھ کام کرو — اس زیست کو لوگ موت بھی کہتے ہیں

مطعونِ زمانہ ہیں یہ افعال تو ہوں
مردودِ ملائکہ ہیں اعمال تو ہوں

ہم اب بھی کریں گے جو ہمیں کرنا ہے
اچھا جو سفید ہو گئے بال تو ہوں

چاکِ دل و سینہ آ کے سلتے ہیں یہاں
آتے ہی گُلِ مُراد کھلتے ہیں یہاں

آ میکدۂ تصورِ دوست میں آ
اک جام میں دو جہان ملتے ہیں یہاں

یہ حکم ہے بندگی کی معراج نہیں
کچھ اور ہے طاعتوں کی سرتاج نہیں

رو رو کے دعا خدا سے کرنے والے
فطرت ترے مشوروں کی محتاج نہیں

کل بزم میں تھیں ہنسی خوشی کی باتیں
ہر اک کہتا تھا اپنے جی کی باتیں

ہم نے جو سُنیں تو ہم کو رونا آیا
یاد آ گئیں اپنی زندگی کی باتیں

اب اپنی نماز اور وہ روزا بھی نہیں
وہ زہد وہ اتقا کا دھڑکا بھی نہیں

تھیں ہم کو خدا سے سیکڑوں اُمیدیں
اب مر گئے تو خدا نے پوچھا بھی نہیں

مُردہ ذرّوں کو میں جِلا لیتا ہوں
پینے میں زمیں کو پلا لیتا ہوں
واعظ کی نگاہِ بد سے بچنے کے لئے
نیکی بھی بدی میں کچھ مِلا لیتا ہوں

ہر شب کو بلا سے خواب میں ڈرتا ہوں
ہر صبح کو اُٹھ کے آہ بھی کرتا ہوں
ہر چند کہ فطرتِ محبت ہے یہی
فطرت کے خِلاف کوشش کرتا ہوں

یارب مرا حال تجھسے مستور نہیں
مجبور ہوں میں گُنہ سے مسرور نہیں
ہوں ترکِ گُنہ کا دل سے شائق لیکن
جتنی ہمّت ہے اُتنا مقدور نہیں

ہر دیر و حرم میں سر جھکاؤں گا میں
توحید کے خوب گیت گاؤں گا میں
تو نے بندہ مجھے بنایا اپنا
تجکو اپنا خدا بناؤں گا میں

ناکامیِ آرزو کا منظر ہے یہاں
کچھ بھی نہیں ہر نظام ابتر ہے یہاں
اس میکدۂ جہان میں مستی کیسی
ساقی ہے نہ شیشہ ہی نہ ساغر ہی یہاں

ہے اور کسی جگہ یہ مرقوم نہیں
مفہوم ہے اس کا وہ کہ مفہوم نہیں
دنیا کا بھی راز کتنا پیچیدہ ہے
ہر اک سے یہی سُنا کہ معلوم نہیں

خجلت سے جو خونِ دل پیا کرتے ہیں
بخشش کی دعائیں جو کیا کرتے ہیں
اللہ کو اپنے عندیے میں شاید
تعلیم کرم کی وہ دیا کرتے ہیں

امید بقائے دورِ عشرت بھی نہیں
اور بزمِ جہاں میں لطف صحبت بھی نہیں
پھر اس پہ لطیف تر لطیفہ یہ ہے
ہم سے فطرت کو کچھ عداوت بھی نہیں

جو جامِ غم و الم دیے جاتے ہیں
ہم ان کو خوشی خوشی پیے جاتے ہیں
جینے کی امید تو نہیں ہے لیکن
مرنے کی اُمید پر جیے جاتے ہیں

راحت نہیں کوئی محفلِ امکان میں
رونق نہیں کچھ بھی باغ میں بُستان میں
کیا شمع کی طرح قبل مرنے ہی کے لوگ
ہو جائیں مقیم جا کے گورستان میں

اک قطرے سے چشمے سو اُبلتے ہیں یہاں   اک رمز سے رمز سو نکلتے ہیں یہاں
ہے پردہ بہ پردہ پرتوِ عالمِ شوق   اک شعلے سے سو چراغ جلتے ہیں یہاں

کچھ محوِ خیالِ خود پرستی میں ہیں   کچھ غرق حضیض اوجِ پستی میں ہیں
ہر ایک ہے مدعی کسی دعوے کا   مطلب یہ ہے کہ ہم بھی ہستی میں ہیں

آوازِ فنا ہر ایک جا سُنتا ہوں   ہر لحظہ ترنمِ بلا سُنتا ہوں
اس دائرۂ فلک میں چکی کی طرح   دانوں کے شکست کی صدا سُنتا ہوں

اے عازمِ مرگ کیوں ہے اتنا غمگیں   واللہ حیات و مرگ میں فرق نہیں
فرق اتنا سا ہے فقط کہ آبادیِ خلق   کچھ زیرِ زمیں ہے کچھ ہے بالائے زمیں

تقدیر جو میری برسرِ کار نہیں   تدبیر بھی میری کوئی ہموار نہیں
پھر کون جہان میں میری فریاد سُنے   روتا ہوں تو جب کہ کوئی بیدار نہیں

آدابِ امورِ دین کا ماہر بھی نہیں
اور شرع کے چھوڑنے پہ قادر بھی نہیں
جنّت میں مری جگہ نہ دوزخ میں جگہ
پورا مومن نہیں تو کافر بھی نہیں

سرگرم غرور و کبریا ہیں لاکھوں
آمادۂ دعوے انا ہیں لاکھوں
آیا ہے عجب یہ دَورِ اُلٹا آسی
بندہ نہیں ایک بھی خدا ہیں لاکھوں

حالانکہ یہ چرخ پر ہیں تو خاک نشیں
لیکن تجھ میں اور ان میں کچھ فرق نہیں
مختارِ سعادت و نحوست آسی
زہرہ نہ زحل نہ مہر و ماہ و پروین

کیوں خطرۂ بد ہم اپنے دل میں لائیں
کیوں پیشروں کی یاس سے گھبرائیں
آؤ نہ چلیں ذرا گلستاں کی طرف
ممکن ہے کہ ہم ہی گُل بداماں آئیں

آلامِ جہاں سے پاک ہونا ہے ہمیں
حیراں نہیں خیرہ ناک ہونا ہے ہمیں
اُٹھ آگ بجھا شراب کے پانی سے
ساقی پھر باد و خاک ہونا ہے ہمیں

ہو جاتا ہوں پست جب اُبھرتا ہوں میں — مغروریِ نفسِ بد سے ڈرتا ہوں میں
ہوتا ہے خلوص تو یہ جس دن دل میں — اُس روز گنہ ضرور کرتا ہوں میں

جب غنچۂ ناشگفتہ کھل جاتے ہیں — اور سیرِ چمن کو اہلِ دل جاتے ہیں
بڑھ جاتی ہے اور دلکشی فطرت کی — بچھڑے ہوئے دونوں وقت مل جاتے ہیں

ذروں سے وہی کلام کر آتا ہوں — افسانۂ غم تمام کر آتا ہوں
جس در پہ ہوا تھا ان کا دیدار نصیب — روزانہ اُسے سلام کر آتا ہوں

نفسِ امارہ کو کچل دوں گا میں — قلبِ سرکش تجھے مسل دوں گا میں
فطرت ہے مری وفا تو فطرت ہی سہی — اپنی فطرت کو بھی بدل دوں گا میں

کھلتا ہی نہیں کوئی طلسماتِ جہاں — مجبور نہ ہو تو کیا کرے پھر انساں
کچھ حد ہے فریب کی وہاں تک آسی — گھٹنے کے لئے جہاں بڑھے عمرِ رواں

روتے ہوئے جو ہلاک ہو جاتے ہیں   کیا سب وہ گنہ سے پاک ہو جاتے ہیں
بارانِ بہار میں ہزاروں قطرے   بہتے ہوئے نذرِ خاک ہو جاتے ہیں

سیاح سوادِ دو جہاں کے ہم ہیں   واقف ہر کوچہ و مکاں کے ہم ہیں
کوئی واقف نہیں ہمارا آسی   ہم ہی ہیں وہاں کے جس جہاں کے ہم ہیں

ہیں ہم ہی خواص اور عامی ہم ہیں   گمنام ہمیں ہیں اور نامی ہم ہیں
جو کچھ ہم میں ہے وہ ہے ہم میں موجود   جو کچھ ہم میں نہیں ہے وہ بھی ہم ہیں

اس وقت جہان میں کوئی خرم بھی نہیں   افکارِ جہاں سے کوئی بےغم بھی نہیں
بےغم ہے اگر کوئی تو میرے نزدیک   انسان نہیں وہ ابنِ آدم بھی نہیں

آئینے کے ساتھ زنگ دیکھے گا یہاں   گوہر میں ہمیشہ سنگ دیکھے گا یہاں
یہ عینکِ وہم اگر رہی آنکھوں پر   تو روز ہزار رنگ دیکھے گا یہاں

ہے زینتِ تن وفا سے زیور سے نہیں
ہے عزتِ سر خرد سے افسر سے نہیں
انساں کی تونگری جہاں میں آسی
ہے بذل و سخا سے در و گوہر سے نہیں

غم کا بھی نہیں ہے اور خوشی کا بھی نہیں
نیکی کا نہیں ہے اور بدی کا بھی نہیں
دل وقف کا مال ہے جہاں میں آسی
ہے سب کیلئے یہ اور کسی کا بھی نہیں

میرا نہ یہ کفر ہے نہ میرا ایماں
بیکار مری طرف ہے دنیا کا گماں
قاتل مجھے کس دلیل سے ٹھہرایا
جب تیر بلا کے ہیں قضا کی ہے کماں

آثارِ صفا کہاں ہیں ان یاروں میں
نیکی ملتی ہے کب خطاکاروں میں
کیا عقل پہ اپنی پڑ گئے ہیں پتھر
عزت کی تلاش ہے ہمیں خواروں میں

اس رنج و بلا میں کچھ تو راحت پائیں
مایوس ہوئے ہیں کچھ تو خوش ہو جائیں
ممکن ہے کہ دوست بھی وہاں مل جائے
چل کوچۂ دوست کی طرف ہو آئیں

ہے گفت و شنید اس کی مشہوروں میں
جلوہ ہے سب اُس کا اور منظوروں میں
ہے اس کی مثال یہ کہ جیسے آسی
مے پیتے ہوں غیر اور مخموروں میں

بگڑے تو بلا سے کچھ مقدر تو نہیں
یہ سہو ہے ہوش روح پرور تو نہیں
ٹوٹے گی تو پھر درست کر لیں گے اُسے
توبہ کوئی میکدے کا ساغر تو نہیں

خود اپنی وفا کا گرم بازار نہیں
یوسف تو بہت ہیں ہم خریدار نہیں
وہ چشمۂ خضر جس سے ملتی ہے نجات
ہے گھر میں ہمارے ہم خبردار نہیں

یوں دل سے ازالۂ تالّم کر لیں
نالہ نہ کریں تو اک تبسّم کر لیں
قادر جو نہیں ہیں آبِ زمزم پہ وہ لوگ
خاکِ درِ دوست سے تیمّم کر لیں

نا واقفِ عالمِ تاسّف تھا میں
احباب میں اپنے بے تکلف تھا میں
زندانِ بلا میں کیوں کیا مجھکو اسیر
دنیا نہ عزیز تھی نہ یوسف تھا میں

آغازِ وفا میں درد و آلام نہیں
آلام کے بلکہ دل میں اوہام نہیں
لیکن یہ نگاہِ دُور بیں کہتی ہے
آغاز کے ذمّے فکرِ انجام نہیں

دلشاد بھی بیقرار ہوتے ہیں یہاں
ذیجاہ ذلیل و خوار ہوتے ہیں یہاں
میخانۂ عشق میں سنبھل کر رہنا
اک جام میں سو خمار ہوتے ہیں یہاں

آوازِ شکستِ دل ہے یہ ساز نہیں
بجتے ہیں یہ تیرے کان آواز نہیں
دھوکے میں نہ آ فریبِ دنیا کے نہ کھا
ہر واقفِ کار محرمِ راز نہیں

اس ہوش و حواس کو ڈبو جاؤں میں
انوارِ خدا میں جا کے کھو جاؤں میں
دنیا مجھے جانتی ہے کیسا کیسا
جیسا کہ نہیں ہوں ویسا ہو جاؤں میں

غفلت میں عزیز عمر کو کھوتا ہوں
کرتا ہوں گناہ اور خوش ہوتا ہوں
دل پر چھائی ہوئی ہے اک محویت
بیدار ہوں اس طرح کہ میں سوتا ہوں

جو لوگ کہ ہم پہ مہرباں نکلے ہیں　　آخر کو وہی بلائے جاں نکلے ہیں
نرمی میں بھی سختیاں ملی ہیں ہم کو　　میووں میں بھی اکثر استخواں نکلے ہیں

سو سال اگرچہ درد و کلفت میں رہوں　　سو سال اگرچہ رات دن رنج سہوں
ہیں وہ تو نہ ہو سکوں گا لیکن آسیؔ　　کوشش یہ ہے مری کہ مَیں مَیں نہ رہوں

طاعت سے خوش اہلِ درد ہوتے بھی نہیں　　اس بیم و رجا میں ہیں کہ سوتے بھی نہیں
بو کر نہیں کاٹنے کی امّید انھیں　　افسوس ہے اُن پہ جو کہ بوتے بھی نہیں

سجدے نہ مزار پر ادا کرتے ہیں　　مسجد میں نہ جا کے طاق ہم بھرتے ہیں
بیخوف ہیں دیو سے پری سے بُت سے　　سو سے نہیں ڈرتے ایک سے ڈرتے ہیں

ابواب خوشی جہاں پہ مفتوح نہیں　　ہے جسم ہی جسم سب کہیں روح نہیں
طوفانِ غم و الم ہے موجود مگر　　دنیا میں کہیں سفینۂ نوح نہیں

ردیف واؤ

جانا نہ کسی نے معنیِ مطلق کو
اس سبز و سپید و سُرخ و استبرق کو
بیکار نہیں ہیں یہ بہتّر فرقے
برحق سمجھے اگر تو سمجھے حق کو

کس طرح ہر اک شفا سے دیوانہ ہو
کیونکر ہر اک خرد سے بیگانہ ہو
سو قرن میں بھی نہو گا پیدا آسی
وہ مرد کہ جس میں خوے مردانہ ہو

دلکش ہے جہاں کس قدر دیکھے تو
ہیں اہلِ ہنر بہت ہنر دیکھے تو
دنیا کے ہر اک چاہ میں اک یوسف ہے
لیکن کوئی صاحبِ نظر دیکھے تو

سب کو موہوم اور مُخیّل سمجھو
موجودِ جہاں وجودِ اوّل سمجھو
جو نقش بجز ایک کے آتا ہے نظر
تم اس کو فریبِ چشمِ احول سمجھو

افسانۂ سوزشِ نہانی نہ سُنو — حالِ غم و رنجِ زندگانی نہ سُنو
ہاں ہاں میں آپ اب اپنی ناخوشی سے خوش ہو لو — اچھا تو نہ سنو میری کہانی نہ سُنو

بے فائدہ آہِ سرد بھرتے کیوں ہو — جو کام نہ ہو سکے وہ کرتے کیوں ہو
اس بوالہوسی سے کیا نتیجہ آخر — جینا ہے تو پھر کسی پہ مرتے کیوں ہو

سامانِ خوشی کے سب فراہم بھی کرو — پھر ہاتھ سے اپنے اُن کو برہم بھی کرو
یعنی کہ ہنسو ضرور حسبِ خواہش — لیکن ہنسنے پہ اپنے ماتم بھی کرو

زخمِ دلِ چاک چاک سیتے جاؤ — میخانۂ فیض سے نہ ریتے جاؤ
حسبِ خواہش تو مل نہیں سکتی ہے — آئے ہو تو تھوڑی پیتے جاؤ

افسانۂ دورِ عیشِ فانی سُن لو — یا قصۂ رنجِ ناگہانی سُن لو
آمادۂ خوابِ مرگ ہے دورِ حیات — سونے کے لئے کوئی کہانی سُن لو

کچھ اس سے غرض نہیں کہ اچھا سمجھو
نکتہ کہتا ہوں ایک نکتا سمجھو
مولا میں کرم نہیں تو بندہ ہے وہی
بندے سے خطا نہ ہو تو مولا سمجھو

یا وقت کو اپنے عیش و عشرت میں کھو
یا کھو ہی چکا تو فکرِ فردا سے نہ رو
یا نام نہ لے کبھی کسی دریا کا
یا کشتیِ عمر آبِ حیواں میں ڈبو

مصروفِ گنہ کیا گیا ہے ہم کو
ظلمت میں جو لے لیا گیا ہے ہم کو
تو پھر یہ ضمیر کیوں ملا ہے آخر
یہ آئینہ کیوں دیا گیا ہے ہم کو

دنیا کو تم اک سرائے دو در سمجھو
رہنے کی یہاں کے حد مقرر سمجھو
ہے اذن یہی کہ اس سے آؤ جاؤ
جو اس میں ہے اسکو اس سے باہر سمجھو

راحت اس شورِ متصل سے پوچھو
افسانۂ عرش آب و گل سے پوچھو
یہ غیب سے عیب داں ملا ہے تم کو
جو کچھ پوچھو وہ اپنے دل سے پوچھو

وہ محرمِ اسرار بنائے کس کو
جو راز ہے وہ راز بتائے کس کو
جب اُس کے سوا نہیں ہے کوئی موجود
پھر جلوہ زمانے میں دکھائے کس کو

غفلت نے جو پیچ میں پھنسایا مجکو
انجام سے بے خبر بنایا مجکو
تو موئے سفید سر میں پیدا کر کے
قدرت نے اک آئنہ دکھایا مجکو

اس گنبدِ بے ستوں میں رہنا سیکھو
جو رنج ملے وہ رنج سہنا سیکھو
سب گفت و شنید بے نتیجہ ہے یہاں
کہنا ہے یہی کہ کچھ نہ کہنا سیکھو

وہ بار ہے اک اگر اٹھائیں اس کو
دستورِ عمل اگر بنائیں اس کو
تو مکتبِ عشق کا یہ پہلا ہے سبق
جو کچھ کہ پڑھا ہے بھول جائیں اس کو

گردوں سے ہمیں کرم کا ارماں کیوں ہو
ظلموں سے ہمارا دل پریشاں کیوں ہو
سائے کی طرح جو خستہ و خوار ہیں ہم
سائے کو فتادگی سے نقصاں کیوں ہو

بتلا اے خاکِ آرمیدہ ہم کو
دکھلا اے سبزۂ دمیدہ ہم کو
ملتے ہیں بہت خدا رسیدہ لیکن
ملتا نہیں کوئی خود رسیدہ ہم کو

پیہم دمِ سرد کیوں بھرے جاتے ہو
بے وقت قضا سے کیوں ڈرے جاتے ہو
مشکل نہیں موت آزماؤ تو سہی
مر جانے سے پہلے کیوں مرے جاتے ہو

رنگینیٔ زندگی کا شیدا کیوں ہو
اور دل میں یہ شوق پھر ہویدا کیوں ہو
ناکردہ گناہ جائے جو دنیا سے
آخر دنیا میں پھر وہ پیدا کیوں ہو

اب چھوڑو خدا کو اور خدا دانوں کو
چھوڑو مذہب کے سارے ارکانوں کو
اس وقت میں ہے وہی مسلماں پکّا
جو شخص بُرا کہے مُسلمانوں کو

مطلق نہ نگاہ نیک و بد پر ڈالو
نفع و نقصان کبھی نہ دیکھو بھالو
ایک ایک کو روز ذبح کرتے جاؤ
اے قوم کی بکریاں چرانے والو

اُبھرو جتنے کہ زیر ہوتے جاؤ   بھاگو جتنے دلیر ہوتے جاؤ
روبہ بازی سے اس جہاں کی نہ ڈرو   اس سے تم اور شیر ہوتے جاؤ

جینے کی طرح جہاں میں جینا سیکھو   ہر ایک جگہ کا اک قرینا سیکھو
جنّت میں شراب تم کو پینا ہوگی   جنّت کے لئے شراب پینا سیکھو

لذت تکلیف میں اُٹھاتے جاؤ   نوحے کی دُھنوں نغمے گاتے جاؤ
عبرت کا سبق صحیفۂ فطرت سے   پڑھتے جاؤ مگر بھُلاتے جاؤ

آزادیِ روح کی کہیں راہ تو ہو   پوری یہ مرادِ حسبِ دلخواہ تو ہو
مرنا ہے قبول مر کے جینا بھی قبول   کمبخت کہیں یہ قصہ کوتاہ تو ہو

ردیف ہائے ہوّز

راحت دنیا میں رہ کے آساں نہ سمجھ
آرام کا اس جہاں میں امکاں نہ سمجھ
جب باغ میں کوئی گُل نظر آجائے تجھے
دل ریش اُسے سمجھ تو خنداں نہ سمجھ

راحت میں کبھی تلف ہوئے بیہودہ
کلفت میں پڑے رہے کبھی آلودہ
گلگشت خیال کرتے کرتے آسی
ہم گردشِ رنگ سے ہوئے فرسودہ

رنجِ افلاس تنگدستوں سے پوچھ
احوال خودی خود پرستوں سے پوچھ
فصلِ گُل و مُل کا ذکر رندوں سے سُن
اسرارِ وجد جا کے مستوں سے پوچھ

ہرچند کہ شیخِ شہر ہے فرزانہ
لیکن رہِ معرفت سے ہے بیگانہ
سوکھے ہی رہیں گے دانہائے تسبیح
سرسبز نہ ہوگا ان کا کوئی دانہ

ہو لاکھ اگرچہ آج تو فرزانہ — آخر میں کہیں گے تجھکو سب دیوانہ
پیمانۂ عیش جلد بھر کر پی لے — بھرتا ہے وگرنہ عمر کا پیمانہ

کیوں تشنہ لبی سے کھینچیے خمیازہ — ساقی کے کرم کا کیجیے اندازہ
جب رات کو بند سب کے در ہوتے ہیں — میخانے کا کھولتا ہے تب دروازہ

اے دوست نہ چھوڑنا در میخانہ — جب تک کہ یہ جسم جان سے ہو بیگانہ
تجھکو یہ خبر نہیں کہ ذرّوں سے ترے — فطرت آندھی بنائے یا پیمانہ

انساں سے زیادہ کس کی حالت ہے تباہ — انساں سے زیادہ کون ہے نامہ سیاہ
یہ وہ ہے کہ روز جس کی گھٹتی ہے عمر — یہ وہ ہے کہ روز جس کے بڑھتے ہیں گناہ

جمعیتِ خاطر کو ذرا چھوڑ کے دیکھ — غفلت کی طرف سے اپنا منہ موڑ کے دیکھ
وحدت کثرت میں یوں سما جاتی ہے — آئینے کو اپنے سامنے توڑ کے دیکھ

گو شوق نے کر دیا ہے حالت کو تباہ
پھر بھی وہ کہہ رہا ہے ہم مُشتِ گیاہ
دیدار کی احتیاج اوروں کو ہے
کافی ہے ہمارے واسطے ایک نگاہ

عاشق ہے تو کیوں ہے ترکِ جاں کا خطرہ
ہے چور تو کیوں ہے پاسباں کا خطرہ
زیبا تو نہیں ہے یہ تجارت کرکے
اب چھوڑ دے یہ سود و زیاں کا خطرہ

رخصت ہوا وقت ابتدائے توبہ
اب آ گیا دورِ انتہائے توبہ
وہ توبہ شکن ہوں میں کہ آتی ہے مجھے
توبہ کی شکست سے صدائے توبہ

رندوں کی یہی ہے انتہائے توبہ
ساغر لب پر رہے بجائے توبہ
میخانۂ عشق ہے یہاں اے آسی
توبہ کی شکست ہے صدائے توبہ

ردیف یائے تحتانی

گو پیشِ نظر جلوہ گری رہتی ہے
فرقت میں مگر جامہ دری رہتی ہے
یوں رہ کے وہ دل میں دل سے ہے پوشیدہ
شیشے میں نہاں جیسے پری رہتی ہے

گردوں کی بساطِ بے شکن کس کی ہے
رقاصۂ چرخ نغمہ زن کس کی ہے
خورشید و قمر لیے ہوئے ہیں مشعل
اے بار خدا یہ انجمن کس کی ہے

جیسے ہی سفیدی آ کے سر میں پہنچی
اک عمر کی عافیت خطر میں پہنچی
رعشے کی ہوئی تمام اعضا میں نمود
کشتیِ سلامتی بھنور میں پہنچی

اس سے ترا زخمِ معصیت سلتا ہے
اس سے ترا غنچۂ وفا کھلتا ہے
اللہ پہ احسان نہ رکھ طاعت کا
اللہ کو بندگی سے کیا ملتا ہے

گلچیں کا خیال تھا چمن میرا ہے — بلبل کا گماں تھا وطن میرا ہے
سُن کر یہ کہا خزاں نے خاموش رہو — گلشن ہی نہیں تمام بن میرا ہے

چھوٹے ہوئے یار منتظر ہیں میرے — مرغانِ بہار منتظر ہیں میرے
پابستگیِ وفا اجازت دیدے — ہر دشت میں خار منتظر ہیں میرے

پھر جامِ شراب کا اگر بھرنا ہے — بیکار یہ احتراز کیا کرنا ہے
پینے میں بہانہ موت کا کیا آسی — مرنا ہے اگر تو ہر طرح مرنا ہے

خلعت یہی صرف باعثِ تزئیں ہے — حالت یہی موجبِ تسکیں ہے
دربارِ بقا میں اُس کو ملتی ہے جگہ — جس جس کا لباس خوں سے رنگیں ہے

کھو بھی گئے ہم کچھ اور کچھ پا بھی گئے — جی بھر کے ہنسے بھی اور شرما بھی گئے
افسوس کہ شاخِ آرزو پر آسی — وہ پھول کھِلے کہ کھِل کے مرجھا بھی گئے

سوتے سوتے جو روحِ پُر سوز کھُلی　　اک شور ہوا عدم میں اور آنکھ کھُلی
دیکھا کہ نہیں جہاں میں کوئی بیدار　　مجبور دوبارہ پھر بھی سونے پہ تُلی

ہر پردے کے حور کی نقاب اُٹھی ہے　　نزدیک کی دُور کی نقاب اُٹھی ہے
موسیٰؑ کو خبر کرو کہ جاؤ دیکھو　　شاید سرِ طور کی نقاب اُٹھی ہے

مدت میں یہ بات جا کے معلوم ہوئی　　مدت میں یہ بات آج مفہوم ہوئی
اسپیچ میں دے رہے ہیں قومی لیڈر　　اس قوم کا فاتحہ جو مرحوم ہوئی

اُلفت میں مرے تو زندگی ملتی ہے　　غم لاکھ سہے تو اک خوشی ملتی ہے
ہر شمع کو بزمِ دہر میں اے آسیؔ　　جلنے ہی کے بعد روشنی ملتی ہے

اسبابِ فراق خود بتائے گا تجھے　　آئینۂ وصل خود دکھائے گا تجھے
تو جس کی تلاش میں پھرا کرتا ہے　　وقت آئے گا تو وہ خود بُلائے گا تجھے

عصیاں سے جو ہم نے راہ کرلی میں نے
سب فردِ عمل سیاہ کرلی میں نے
جو عمر گناہ سے بچائی تھی بجبر
خجلت میں وہ سب تباہ کرلی میں نے

اے ننگِ وجود و کامیابِ ہستی
ہیں ہفتہ و ماہ و سال بابِ ہستی
جس روز کیا تمام ان بابوں کو
اُس روز تمام ہے کتابِ ہستی

کس بات کا خوف ہے یہ کیسا ڈر ہے
کیا موت نظامِ زیست سے باہر ہے
اتنا ہی تو موت و زندگی میں ہے فرق
کل سر پہ تھا چاند آج تربت پر ہے

اے دشمنِ عافیت یہ کیسا غم ہے
کس بات کا گھر میں روز و شب ماتم ہے
دولت ہوتی تو اک خلش بھی ہوتی
کچھ بھی نہیں تیرے پاس یہ کیا کم ہے

ملنا کوئی ایسی چیز اب مشکل ہے
نعمت ہے یہ اور نعمتِ کامل ہے
کیوں دل کو تباہِ معصیت کرتا ہے
یہ حاصلِ زندگی لاحاصل ہے

آساں بھی یہی ہے اور یہی مشکل ہے ۔ دریا بھی یہی ہے اور یہی ساحل ہے
جو کچھ کرنا ہے زندگی میں کر لو ۔ غربت بھی یہی ہے اور یہی منزل ہے

لے نالوں کی درد مند ہو جائیگی ۔ دنیا کو یہی پسند ہو جائے گی
میں پست سمجھ رہا ہوں جس کو آسی ۔ اک دن یہ صدا بلند ہو جائے گی

عصیاں میں مطیعِ نفس کافر ہو کے ۔ زندی میں سب آبروئے ایماں کھو کے
جاتے ہیں سوئے کعبہ لیے ہاتھ میں سبحہ ۔ اللہ کو تاکہ دے سکیں کچھ دھو کے

سو عرش سے مضمون اتارے میں نے ۔ سو باغ کلام کے سنوارے میں نے
لیکن کوئی فائدہ نہ دیکھا آسی ۔ اندھوں کی طرف کیے اشارے میں نے

اے کاش یہ عشق جاودانی ہو جائے ۔ اے کاش یہ یاس کامرانی ہو جائے
وہ زیست ملے کہ موت سے بدتر ہو ۔ وہ موت ملے کہ زندگانی ہو جائے

نذرِ غمِ عشق زندگانی کی ہے
قربانِ فراق کامرانی کی ہے
دشمن سے کبھی وہ ہو نہ سکتی آسی
جو اپنے پہ ہم نے مہربانی کی ہے

معمورے یہاں کے ہم نے ویراں پائے
مجموعے یہاں کے سب پریشاں پائے
دریائے رواں تھی زندگانی لیکن
ہر موج میں اس کی لاکھ طوفاں پائے

وہ موت کہاں جو شکلِ ہستی ہو جائے
وہ ضعف کہاں جو چیرہ دستی ہو جائے
وہ عقل کہاں جو بیخودی میں گُم ہو
وہ ہوش کہاں جو رشکِ مستی ہو جائے

دنیائے دنی سے جبکہ رحلت ہوگی
دل میں کوئی پیاری پیاری صورت ہوگی
جانا ہے اندھیری قبر میں بعدِ فنا
اُس گھر میں چراغ کی ضرورت ہوگی

ہیں بے خبرِ مآل آفت یہ ہے
صورت ہی کوئی نہیں ہے صورت یہ ہے
منزل جو دراز ہو تو کچھ خوف نہیں
منزل کی خبر نہیں قیامت یہ ہے

عاشق بھی ہے امید سے مسرور بھی ہے ‏ ‏ اور اس میں خیالِ دوست کا نور بھی ہے
میں اس دلِ مبتلا سے خوش ہوں آسی ‏ ‏ موسیٰ بھی ہے یہ شجر بھی ہے طور بھی ہے

کب کوئی کسی کا مونس و ہمدم ہے ‏ ‏ بنیاد وفا کی سخت نامحکم ہے
میرے ‏ لیکن ترا غم ہے تیرے دل کا مونس ‏ ‏ باقی ہے اگر یہ غم تو پھر کیا غم ہے

شاید غم سے کبھی فسردہ ہو جائے ‏ ‏ شاید گل کی طرح فسردہ ہو جائے
زندہ ہے جو آج دل تو دلشاد نہ ہو ‏ ‏ ممکن ہے کہ آج ہی یہ مردہ ہو جائے

جنت بھی اگر نہ ہو تو جنت مل جائے ‏ ‏ نعمت بھی اگر نہ ہو تو نعمت مل جائے
سب کچھ ہے وہ میرے واسطے اے آسی ‏ ‏ دل کو اگر ایک آہ حسرت مل جائے

اللہ ری یہ جذبِ آہ کی بے اثری ‏ ‏ اللہ ری یہ درد اور یہ خونیں جگری
دریوزہ کے واسطے نہیں ہے کاسہ ‏ ‏ کاسے کے لیے کرتا ہوں دریوزہ گری

مشکل سے یہ شکل خوشنما نکلی ہے — مشکل سے یہ صورتِ دلربا نکلی ہے
ہستی و عدم کا مل گیا ہے جب ساز — تب زیست کی جانفزا صدا نکلی ہے

کتنی یہ عمرِ بے بقا نکلی ہے — کیا اس کو سمجھ رہا تھا کیا نکلی ہے
آئینے کو دیکھ کر یہ جانا میں نے — ہستی میری عدم میں جا نکلی ہے

ذوقِ تجرید میرا سرمایہ ہے — رنگِ تفرید میرا پیرایہ ہے
تنہائی ہے میری صرف ہمدم میری — ہمسایہ مرا فقط مرا سایہ ہے

وصلت کا کوئی اثر نہ دیکھا میں نے — دیدار کا کچھ ثمر نہ دیکھا میں نے
میں آئنۂ جمالِ دلبر نکلا — اُس نے دیکھا مگر نہ دیکھا میں نے

یہ جام بدست ہے تو یہ برلب کیا ہے — یہ عشقِ بُتاں یہ شور یارب کیا ہے
کیسی ہے الٰہی یہ تلوّن کیشی — میں کون ہوں اور میرا مذہب کیا ہے

اک زحمتِ ناروا ہے راحت کیا ہے — اک کلفتِ غم فزا ہے عشرت کیا ہے
دل ساغرِ جم سہی مگر اے آسی — جب ٹوٹ گیا تو اسکی قیمت کیا ہے

دل مٹ گیا آہِ نارسا باقی ہے — طاقت نہیں نالہ و بکا باقی ہے
کچھ حال نہیں ہے مجھ میں ور ہے وہی حال — اب ساز نہیں رہا صدا باقی ہے

اس طرح بنائے شعر ڈالی میں نے — گویا کہ نئی راہ نکالی میں نے
بلبل نے اڑائی تھی روش جو میری — بلبل کی وہی روش اڑا لی میں نے

نغموں میں بھی ہے صدائے ماتم باقی — ہے وصل میں بھی فراق کا غم باقی
دریا ہونٹوں پہ آگیا ہے لیکن — ہے اب بھی وہ تشنگی کا عالم باقی

اس زہد کی آبرو ڈبو لے پہلے — دامن کو شراب سے بھگو لے پہلے
پھر دل سے صفائے دل کی کوشش کرنا — آلودہ معصیت تو ہو لے پہلے

رنجوں کی طرف خوشی کو مائل کر لے
مایوس بن اور مُراد حاصل کر لے
ملتی ہے اسی طرح حیاتِ ابدی
جا موت کو زندگی میں شامل کر لے

جز حُسن یہاں عیاں نہیں ہے کوئی
جز عشق یہاں نشاں نہیں ہے کوئی
یا تیرے سوا نہیں کسی کا بھی وجود
یا میرے سوا یہاں نہیں ہے کوئی

گنوائی گئی ہیں جو خطائیں میری
ثابت ہوں ابھی وہ سب وفائیں میری
دوں گا میں گناہ بیگناہی کا ثبوت
بخشے تو سہی کوئی خطائیں میری

جو پہلے تھی مدعا طرازی میری
مسٹ کروہ ہوئی ہے جانگدازی میری
آئین نیاز بھی نہیں ہے مرغوب
اللہ اللہ بے نیازی میری

حالِ غم و رنجِ اضطراری سُن لے
کیفیت درد و بیقراری سُن لے
مایوس ہیں اور دعا کیے جاتے ہیں
اک روز تو اے خدا ہماری سُن لے

مینا کو سرِ نیاز سمجھو آسی　　اور جام کو چشمِ باز سمجھو آسی
اس بزمِ جہاں میں اتنے غافل نہ رہو　　یہ محفلِ امتیاز سمجھو آسی

کس جرم پہ کر رہی ہے یہ شرم اتنی　　کس ضعف پہ ہے یہ محوِ آزرم اتنی
بھاگی ہوئی جا رہی ہے کیوں عمرِ رواں　　ہے کس کی تلاش میں یہ سرگرم اتنی

منظورِ نظر ہے زہد یا میخواری　　مستی ہے تجھے پسند یا ہشیاری
بیکار غنودگی میں کیا بیٹھا ہے　　یا خواب پسند کر لے یا بیداری

طاعت سے بچے تو نفس کی چوری ہے　　انوار نہ دیکھ پائے تو کوری ہے
لیکن بعدِ گناہ فکرِ توبہ　　کمزوری کے بعد اور کمزوری ہے

اکسیر ہے اور خاک کہتے ہیں اسے　　غفلت ہے اور انہماک کہتے ہیں اسے
یہ عشق ہے اس کی ہے نرالی فطرت　　بیداریِ خوابناک کہتے ہیں اسے

دل میں تپِ عشق کے وہ چھالے نہ رہے　　آلے تھے جو زخمِ دل وہ آلے نہ رہے
اللہ تو ہے اسی طرح سے موجود　　اللہ کا نام لینے والے نہ رہے

یارب توفیق اپنی طاعت کی دے　　پستی کو مری تو ہمتِ عالی دے
جو خلعتِ عافیت ہوا ہے پارہ　　تو رشتۂ لطف سے پھر اسکو سی دے

آگر نہ اجل جو آب اُن کی کھوتی　　صورت جو قیام کی کچھ اُن میں ہوتی
ہوتی جو کوئی خوشی ہنسی میں اُن کی　　کیوں پھولوں میں آکے روز شبنم روتی

پہلو میں اک آگ سی بھری رہتی ہے　　آنکھوں میں ہمیشہ اک تری رہتی ہے
دل شاخِ اُمید تھا اور اکثر ہر شاخ　　کٹنے پہ بھی مدتوں ہری رہتی ہے

وہ مے جو دوائے جانِ غمدیدہ ہے　　وہ جوئے رواں ہے زینتِ دیدہ ہے
ہے آگ اگر تو اس میں پانی کا ہی میل　　پانی ہے تو آگ اس میں پوشیدہ ہے

جب مے سے بھرا ایاغ دیکھا میں نے
ہر وہم سے اک فراغ دیکھا میں نے
اُس وقت کھُلی حقیقتِ حالِ بہشت
آنکھوں سے وہ سبز باغ دیکھا میں نے

نہ

آساں بھی کام اور بہت مشکل ہے
اس رنج میں کچھ سرور بھی شامل ہے
فریاد کروں میں عشق میں یا نہ کروں
جنت غمِ دوست ہے جہنم دل ہے

ویران زمانے بھر کو کر جائیں گے
پیدا جو ہوئے ہیں سب وہ مر جائیں گے
کچھ آئے تھے اور گزر گئے دنیا سے
کچھ آئیں گے اور پھر گزر جائیں گے

ہر چند کسی کی فکرِ عالی ہو گی
لیکن نظر اس طرف نہ ڈالی ہو گی
یہ خاک کا پیٹ پہلے بھر جائے گا
یا پُشت زمیں کی پہلے خالی ہو گی

ہرگز دل اپنا بیوفاؤں کو نہ دے
آئینہ صاف خود نماؤں کو نہ دے
بیگانے تو بیگانے ہیں پھر اے آسی
تو اس کا نشان آشناؤں کو نہ دے

اسرارِ وجود خام و ناپختہ رہے — جو گوہرِ بے بہا تھے ناسُفتہ رہے
ہر اک نے فضول اس میں تقریریں کیں — جو نکتے کہ گفتنی تھے ناگفتہ رہے

جو دل ہے یہاں غموں کا گنجینہ ہے — داغوں سے بھرا ہوا ہے جو سینہ ہے
میں بھی حیراں ہوں اور جہاں بھی حیراں — آئینے کے سامنے اک آئینہ ہے

کیا روئے جو شامِ غم میں تنہا روئے — کیا روئے جو چشمِ نم سے دریا روئے
ایذا طلبی یہ چاہتی ہے آسی — ہم روئیں تو ساتھ ساتھ دنیا روئے

خوش آئے تھے اس جہاں سے غمناک چلے — پاک آئے تھے اور سخت ناپاک چلے
اس آمد و شد سے کیا نتیجہ نکلا — کیا خاک آئے تھے کیا خاک چلے

دعویٰ جو ذرا عشق میں کافی ہو جائے — تقریر جو وجہ سینہ صافی ہو جائے
جو دار پہ چڑھ جائے وہ منصور بنے — جو برہنہ پا ہو بشرِ حافی ہو جائے

گر علم کا اک ورق میسر ہو جاے — انساں کو نہ چاہیے کہ خود سر ہو جاے
آجائے جو انقلاب کا اک جھونکا — شیرازۂ کونین ابھی ابتر ہو جاے

اس عشرتِ بے بقا سے خوشدل کیوں ہے — اس کلفتِ جانگزا سے بسمل کیوں ہے
یہ کچھ نہیں دونوں ہیچ ہیں اے آسی — اے مردِ خدا خدا سے غافل کیوں ہے

رنگِ عشرت نے ہم سے نیرنگی کی — نغموں نے ہمارے خارج آہنگی کی
جس سینے میں اک جہاں سما سکتا تھا — آخر میں نفس سے اس نے دلتنگی کی

مطرب فانی ہے اور ساقی فانی — تو اور ترا ہر اک ملاقی فانی
بے بود ہے بود اس جہاں کی آسی — باقی باقی ہے اور باقی فانی

حیران زمانے کو بنایا ہم نے — اک نغمۂ بے صدا سنایا ہم نے
آئینۂ وہم میں مثالِ تصویر — جو جلوہ کہ کچھ نہ تھا دکھایا ہم نے

جھگڑا ہی مروّت کا نہ پالا ہم نے — احباب پہ بار اپنا نہ ڈالا ہم نے
درماندگی و فتادگی میں آسی — سائے کی طرح خود کو سنبھالا ہم نے

ہیں گرچہ ہزار رنج سہنے والے — ہم پھر بھی ہیں بات مُنہ پہ کہنے والے
ہم تجھسے دبے ہوئے ہیں لیکن اے چرخ — نالے نہیں تجھسے دُب کے رہنے والے

سب کو دمِ سرد اس جگہ بھرنا ہے — سب کو اسی ایک حال میں مرنا ہے
جو بندۂ حق نہیں وہ ہیں بندۂ نفس — بندوں کو غرضکہ بندگی کرنا ہے

یا نغموں کی صوتِ جانفزا نکلے گی — یا نالوں کی صوتِ جانگزا نکلے گی
جب تک باقی رہے گا یہ تارِ نفَس — دِل سے ترے اک نہ اک صدا نکلے گی

کیوں ہستیِ بے بقا پہ اِتراتا ہے — کیوں نشّے سے تیرا سر پھرا جاتا ہے
آئینے میں اپنے عکس کو دیکھ ذرا — اک اور جہاں میں نظر آتا ہے

آئین و طریق و دین و مشرب کیا ہے
کفر و اسلام کیوں ہے یہ سب کیا ہے
مذہب ہے اگر خدا کے خوش کرنے کو
ہم بھی تو سنیں خدا کا مذہب کیا ہے

وابستہ ہے مخلوق سے سازِ ہستی
خالق سے نہیں ہے ساز و بازِ ہستی
مطلق جو ہے کس طرح مقیّد ہوگا
موجود ہے اور ہے بے نیازِ ہستی

کیا بیٹھا ہے بیخودی میں آنکھیں کھولے
داغِ غفلت سے دامنِ دل دھولے
پھر وقت نہ آئے گا پشیمانی کا
ہونا ہے تو دو گھڑی پشیماں ہولے

وہ دولت و مرتبت کہاں سے آئے
وہ ثروت و مقدرت کہاں سے آئے
دریائے شراب جلوہ بہتا ہے مگر
پیمانۂ معرفت کہاں سے آئے

میخانۂ زندگی جو معمور ہوئے
ویراں ہوئے اور سب بدستور ہوئے
کرتے ہی خیالِ کاسہ ہائے سر کا
آتی ہے صدا کہ سب کے سب چور ہوئے

فرمانِ جفا ہے اور ہم ہیں آسی
فقدانِ وفا ہے اور ہم ہیں آسی
دنیا میں نہیں کوئی سہارا باقی
بس ایک خدا ہے اور ہم ہیں آسی

ہشیار رہو کہ زندگی جاتی ہے
تیار رہو کہ زندگی جاتی ہے
دنیا تاریک شب ہے سونے والو
بیدار رہو کہ زندگی جاتی ہے

جب سے کہ پیا ہے جامِ عشرت میں نے
پائے ہیں سرور و عیش و راحت میں نے
جنت کی نہیں رہی تمنا باقی
دنیا کو بنا لیا ہے جنت میں نے

بیکار ہے کاوشِ عروج و پستی
بیکار ہے فکرِ نیستی و ہستی
مستی میں گزار زندگی کو آسی
مستی ہستی ہے اور ہستی مستی

سامانِ طرب فزا مہیا کر کے
دنیا سے صفائے دل کا دعوا کر کے
وحدت کو بنا دیا ہے کثرت ہم نے
آئینے میں اپنے عکس پیدا کر کے

اک آرزوئے طرب چلی جاتی ہے — اک خواہش بے سبب چلی جاتی ہے
پینے کی سکت نہیں ہے مستوں میں مگر — ساقی سے وہی طلب چلی جاتی ہے

پھر چاک دلِ حزیں کو سینا نہ پڑے — پھر خونِ جگر کسی کو پینا نہ پڑے
اُس حشر کی مجکو جستجو ہے آسی — مرنے والوں کو جس میں جینا نہ پڑے

پھیلا ہوا سوز اک ترانے کا ہے — اک باب کسی نئے فسانے کا ہے
جس کو سمجھے ہیں آسمان اور زمیں — اُلٹا ہوا اک ورق زمانے کا ہے

گو دورِ سرور و خرّمی ہے ساقی — فانی ہے خوشی تو کیا خوشی ہے ساقی
جس جام سے تو پلا رہا ہے مجکو — جانے کتنوں نے اسمیں پی ہے ساقی

مستی ہو شباب ہو تو سب کچھ ہے وہی — مطرب ہو رباب ہو تو سب کچھ ہے وہی
یہ کچھ بھی نہو اگر تو پھر اے آسی — ساقی ہو شراب ہو تو سب کچھ ہے وہی

طاقت نہیں زورِ ناتوانی تو ہے
رنگ اُڑ گیا اشکِ ارغوانی تو ہے
کیا اس سے نہ کہہ سکوں گا حالت اپنی
آخر یہ زبانِ بے زبانی تو ہے

میخانے میں لطفِ زیست پانے والے
مینا و سُبو سے دل لگانے والے
پی لی ہے تو میکدے کو خالی کر دے
باقی ہیں ابھی بہت سے آنے والے

ماضی تھا لہو و لعب بازی کے لئے
اور حال ہے درد و دلگدازی کے لیے
بیکار نہ رکھ امید مستقبل سے
مستقبل زندگی ہے ماضی کے لیے

کیوں رنج و ملالِ ہجر سے مضطر ہے
کیوں وصل کی ہر گھڑی دعا لب پر ہی
دریا میں ہے خوف ڈوب جانے کا بہت
اچھا ہے وہی کہ جو کنارے پر ہے

کچھ دیکھ کے رنگِ بزم شرمائیں گے
کچھ آئیں گے اور کچھ مزا پائیں گے
یہ بزم مگر یونہی رہے گی تا دیر
آئینگے بہت سے اور چلے جائیں گے

کیا لے گا تو سر کو وقفِ سودا کر کے — کیا لے گا جہاں کا نظارا کر کے
اک بزم فریب ہے یہ آیا جو یہاں — رخصت ہوا اک نہ اک بہانا کر کے

سرمایۂ غم تھی شادمانی کیا تھی — مایوسیِ دل تھی کامرانی کیا تھی
پیری نے چھڑا دیا غموں سے آسی — اندوہِ مدام تھی جوانی کیا تھی

غرفے سے جھلک دکھا گیا ہے کوئی — سرشارِ وفا بنا گیا ہے کوئی
آنکھیں کھلتی ہیں اور مندی جاتی ہیں — اک رطلِ گراں پلا گیا ہے کوئی

اب قصدِ وفا سے روٹھ جانے کا ہے — اب قصدِ دعا سے ہاتھ اٹھانے کا ہے
اس زیست سے کام کچھ نہ نکلا آسی — اب قصدِ اجل کو آزمانے کا ہے

دل میں گردِ غمِ تمنا ہی نہ رہے — یہ داغِ گناہ یہ تباہی نہ رہے
یوں خوب سے رو کہ تیرے رونے کے بعد — پتلی کی بھی آنکھ میں سیاہی نہ رہے

وہ کیفِ بقا سراب کہتے ہیں جسے
وہ خوابِ گراں شباب کہتے ہیں جسے
اُس دَور نے مجکو مار ڈالا آسیؔ
زاہد ابتک حباب کہتے ہیں جسے

جو رند ہیں وہ شہاب کہتے ہیں اُسے
جو مست ہیں وہ شراب کہتے ہیں اُسے
جو عام ہیں معتبر نہیں قول اُن کا
جو خاص ہیں آفتاب کہتے ہیں اُسے

سبزہ صحنِ چمن میں لہراتا ہے
پانی موجوں میں آ کے بَل کھاتا ہے
یہ ہم کو بتا رہے ہیں سب اے آسیؔ
پردے میں ہے اور کوئی شرماتا ہے

اک داغِ حیات کا دیا ہے تو نے
اک موت میں امتحان کیا ہے تو نے
اب حشر کا کیوں ہوا ہے فتنہ برپا
سَو بار تو آزما لیا ہے تو نے

بالا کے لیے نہ فکر پستی کے لیے
غیروں کے لیے نہ خود پرستی کے لیے
کس وہم میں پڑ گیا ہے تو اے آسیؔ
ہستی ہے اگر تو محض ہستی کے لیے

ہر بار یہ شاخِ بید ہو جاتی ہے　　بخشش کی مجھے امید ہو جاتی ہے
چھنٹ جاتی ہے رونے سے سیاہی دل کی　　بارش سے گھٹا سفید ہو جاتی ہے

غنچہ پھینکا ہے خار لے کر میں نے　　شمعِ گل کی شرار لے کر میں نے
دل کھو کے کیا ملالِ خاطر پیدا　　آئینہ دیا غبار لے کر میں نے

باقی رہی باغِ زہد کی شادابی　　چہرہ رہا رنگِ بادہ سے عنابی
مسجد نہ گیا تو کیا ہوا اے آسی　　قد بارِ گناہ سے ہوا محرابی

سرمایۂ نقدِ عمر کھو کر اُٹھے　　اُٹھے مگر آبرو ڈبو کر اُٹھے
آیا پسِ عمرِ رفتہ توبہ کا خیال　　جب قافلہ جا چکا تو سو کر اُٹھے

انساں ہوں میں اور خطا مرا منصب ہے　　مالک ہے وہ اور کرم اُسے انسب ہے
جو چاہیے مجھ میں ہے وہ مجھ میں موجود　　اور جو اُسے چاہیے وہ اُس میں سب ہے

جب وہ مجھے طعنۂ وفا دیتا ہے
دُکھتا ہوا دل مرا دُکھا دیتا ہے
آنسی میں چھپاؤں حال اپنا کیونکر
چہرہ مرا سب اُسے بتا دیتا ہے

مقصودِ حیات ساغر و ساقی ہے
باقی جو کچھ ہے وہ سب الحاقی ہے
کر جاگ کے ہجر میں شبِ عمر تمام
سونے کے لیے تو زندگی باقی ہے عیش

تو نے مجھے جو عمر عطا کر دی تھی
سب نذرِ گناہ اے خدا کر دی تھی
اب تو بھی کرم کی انتہا کر دینا
میں نے بھی خطا کی انتہا کر دی تھی

ساقی ہیں حیا۔ حیا میں گھٹائیں ہیں وہی
محفل میں فضا فضا میں باتیں ہیں وہی
غافل ہیں شرابِ مرگ پینے والے
چھٹکی ہوئی چاندنی کی راتیں ہیں وہی

جاتے ہی شباب جان آفت میں ہے
بے لطف ہے ہر گرنہ جو قسمت میں ہے
جب دل کے سبب سے میں مصیبت میں تھا
اب دل مری وجہ سے مصیبت میں ہے

وہ عیش و سُرور و کامرانی دیدے
وہ جوش وہ لطفِ زندگانی دیدے
دولت کی مجھے نہیں ہے حاجت اے چرخ
جو چھین چکا ہے وہ جوانی دیدے

امواجِ غم و الم سے ٹکراتا ہے
گردابِ بلا میں پیچ و خم کھاتا ہے
اک بحرِ رواں ہے عمر جس میں انساں
تنکا سا بہا ہوا چلا جاتا ہے

کچھ مجکو بھی اُن سے آرزو باقی ہے
کچھ اُن کو بھی مجھسے گفتگو باقی ہے
ان سے یہ پتا چل رہا ہے آسی
سینے میں ہمارے کچھ لہو باقی ہے

جب سے کہ بلا سے تو یہ اپنے سر لی
بھرنی جو نہ تھی وہ سب مصیبت بھر لی
توبہ سے بھی کچھ کام نہ نکلا آسی
اب توبہ کے نام سے بھی توبہ کر لی

اس حرفِ وفا کا ایک دفتر ہو جائے
اس پر توِ غم کا ایک منظر ہو جائے
جو آہ کہ جوش زن ہے دل میں یارب
کچھ بھی نہ بنے تو شورِ محشر ہو جائے

جب شامِ الم بہت ستاتی ہی مجھے
ہر حال سے بے خبر بناتی ہی مجھے
تو کہتا ہے مجھسے دل کہانی تیری
پھر ٹوٹ کے خوب نیند آتی ہی مجھے

دیتا ہی نہیں ہے کچھ اگر دیتا ہے
راحت کم ، رنج بیشتر دیتا ہے
پیمانۂ آسماں ہیں ماہ و خورشید
جو کچھ دیتا ہے ناپ کر دیتا ہے

کب ایک کو دوسرے کا غم ہوتا ہے
سہتا ہے وہی جس پہ ستم ہوتا ہے
یہ واقعہ روز دیکھتے ہیں شب کو
شبنم روتی ہے اور جہاں سوتا ہے

پُرساں مرے داغِ دل کا گر تو ہو جاے
فرصت کا مرے جو کوئی پہلو ہو جاے
تو گُلشنِ رنگ و بُو بدل جاے تمام
لالے میں گلاب کی سی خوشبو ہو جاے

نیرنگِ زمانہ تھی نمودِ ہستی
بدلی لاکھوں طرح سے بودِ ہستی
موہاے سفید سے بوقتِ آخر
تقدیر نے کی ہے تار و پودِ ہستی

ارمان دل کا ترے نکل سکتا ہے
جو کام کہ بند ہے وہ چل سکتا ہے
جس نے لکھی ہے سرنوشتِ تقدیر
اپنے لکھے کو وہ بدل سکتا ہے

یہ نرگسِ میگسار کیا کہنا ہے
یہ سنبل مشکبار کیا کہنا ہے
یہ صحن چمن یہ سبزہ یہ گُل یہ نسیم
کیا کہنا ہے اے بہار کیا کہنا ہے

تو اصل حقیقت کو ذرا جان تو لے
جو کچھ کہ بتا رہا ہوں وہ مان تو لے
تو جس کی تلاش میں رہا کرتا ہے
تو خود بھی وہی ہے خود کو پہچان تو لے

اُمید ہی طولِ زیست کا حاصل ہے
اُمید ہی باعثِ فراغِ دل ہے
کہتے ہیں کہ ہے فراق دشوار مگر
امیدِ وصال ہو تو کیا مشکل ہے

ہر کھیت کو کاٹتے ہیں بونے کے لیے
دیتے ہیں الم سکون ہونے کے لیے
دل کا ترے اضطراب بیکار نہیں
گہوارے کی جنبشیں ہیں سونے کے لیے

یارب تو کرم کا اپنے ساماں کردے
اب مجکو عطا خلوص ایماں کردے
کافر کیے بہت ہیں مسلماں تو نے
اک گبر کو اور بھی مسلماں کردے

طوبیٰ و بہشت کی ہوائیں کھائے
میوے جنت کے کھا کے لذت پائے
انساں ہیں ہم رہیں گے انسانوں میں
زاہد ہے ملک تو آسماں پر جائے

کب جود و سخا سے کچھ کمی آتی ہے
دولت جاتے ہی پھر پلٹ آتی ہے
دیکھا نہیں تم نے کیا کہ دریا میں موج
اک جاتی ہے اور دوسری آتی ہے

لا جامِ شراب اے ندیمِ سحری
لائی خبر سحر شمیمِ سحری
ہے وقت یہی لطافتِ فطرت کا
چھن کر چلنے لگی نسیمِ سحری

ہیں محوِ جمالِ عالمِ بوالعجبی
ہیں بے خبر مآلِ عقبیٰ طلبی
لیکن کوئی کس طرح سے سمجھے یہ راز
سامع ہندی ہیں گفتگو ہے عربی

ہیں خانقہِ ریا کے جتنے بانی — بنتے ہیں جُنیدؒ و بایزیدؒ ثانی
شیطان کو دے رہے ہیں آرام تمام — کرتے ہیں یہ خود نیابتِ شیطانی

زینت ہے فقیری اور سُلطانی کی — پوشاک ہے جہل اور نادانی کی
ہر شخص کے جسم پر ہے موزوں یکساں — کیا بات ہے اس لباسِ عُریانی کی

لیلیٰ کی تلاش میں دلِ سودائی — گھر سے نکلا تھا کل بصد رسوائی
آیا جو پلٹ کے کوچۂ لیلیٰ سے — کرنے لگا خود بھی دعویٔ لیلائی

مے پر کبھی غور بھی کیا ہے تو نے — اس کا کبھی دور بھی کیا ہے تو نے
دنیا میں کبھی دسیسہ کاری کے سوا — اے شیخ کچھ اور بھی کیا ہے تو نے

دنیا میں جو آ کے نیست سے ہست ہوئے — اک جامِ فنا سے آخرش پست ہوئے
کچھ بعد ہمارے آ کے ہوں گے سرشار — کچھ ہم سے بھی پہلے پی کے بدمست ہوئے

ہاں خلعتِ عیش کو سیے جا تو بھی
جتنی کہ تجھے ملے پیے جا تو بھی
لائق جو خدا کے ہے کرے گا وہ خدا
شایاں جو ترے ہے وہ کیے جا تو بھی

اک طرفہ جفا و جور کیوں کوئی سہے
مجبور رہے تو کتنا مجبور رہے
اے جذبِ وفا وفا کا ہی لطف جبھی
ہم نالہ کریں تو کوئی لبّیک کہے

جیسا کعبہ ہے ویسا بُت خانہ ہے
ہاں حالتِ ظاہری جُدا گانہ ہے
دونوں میں نہیں کوئی تفاوت آسیؔ
دو گھر ہیں اور ایک صاحب خانہ ہے

شاہی کی ہوس نہ حسرتِ جلیش مجھے
البتہ ہے زہد رفتہ پر طیش مجھے
جو زہد نے خانقہ میں چھینا تھا کبھی
پھر میکدے میں ملا ہے وہ عیش مجھے

ہے محض خوشی کا غم تکلف کیلیے
ہے اصل ہیں ورنہ دل تاسف کیلیے
وہ وحشتِ بلا ہے عرصۂ عمر آسیؔ
سو چاہ ہیں جسمیں ایک یوسف کیلیے

آسی غمِ عاقبت کا کیا رونا ہے
مر کر لبِ جوئے خلد پر سونا ہے
اب کیوں نہ کریں تلاشِ ساغر و نغمہ و مے
جب آخرِ کار سب یہی ہونا ہے

صحبت تھی اک سفینہ اور دانا سے
پہنچے دریا پہ دامنِ صحرا سے
عاقل تو ادھر تلاشِ کشتی میں رہا
دیوانہ گزر گیا اُدھر دریا سے

جب پیشِ نظر یہ صورت آجاتی ہے
پھر حسرتِ مُردہ زندگی پاتی ہے
تو فتنۂ حشر اگر نہیں ہے ظالم
تو مُردوں کے تن میں جان کیوں آتی ہے

یہ روح جو زندگی پہ اِتراتی ہے
یہ زیست فنا سے یوں جو گھبراتی ہے
مرتے ہی یہ شکل خاک بنتی ہے مگر
پھر خاک سے بھی غبار ہو جاتی ہے

بت گر نے کہا کہ نور بتخانے میں ہے
صوفی نے کہا ہمارے کاشانے میں ہے
ساقی نے کہا نہیں وہ میخانے میں ہے
رندوں نے کہا وہ میرے پیمانے میں ہے

عاشق کہ خود نما بنائے نہ گئے
گھر سے کہیں اپنے وہ نہ آئے نہ گئے
کردی تھی انھوں نے انتہا عزلت کی
اللہ کے گھر بھی بے بُلائے نہ گئے

ہر ایک کے دل میں غم کا اک ولولہ ہے
قسمت کا ہر ایک شخص کو کچھ گلہ ہے
سب روتے ہیں شیشۂ مے کی طرح
جو کوئی جہاں میں ہے وہ کم حوصلہ ہے

جب فصلِ بہار خندہ زن آتی ہے
یوسف بن کر سوے وطن آتی ہے
مہجورِ بہار بیچ کر کہتے ہیں
فریاد کہ بوئے پیرہن آتی ہے

نیرنگیِ دہر سے گزرنا ہے مجھے
کیا ایسی جگہ میں رہ کے کرنا ہے مجھے
مفلس کو جہاں یہ غم کہ جیتا کیوں ہوں
منعم کو جہاں یہ ڈر کہ مرنا ہے مجھے

دل ہر دوست سے جُدا کرنا ہے
آخر میں سفر سوئے خدا کرنا ہے
پیمانِ وفا کسی سے محکم نہ کرو
اک روز گرہ یہ تم کو وا کرنا ہے

مانا کہ دعا مری اثر پائے گی
مانا کہ مُراد پوری ہو جائے گی
وہ دوست کہاں سے جمع ہوں گے اسّی
وہ عمرِ گزشتہ کیسے پھر آئے گی

وہ معصیت اور وہ خطا کافی ہے
جو کچھ کہ ہوا بہت ہوا کافی ہے
پیری ہے سحر تری جوانی تھی رات
جو ظلمتِ شب میں کر لیا کافی ہے

اس طرح کے خیرہ سر بہت سے ہوں گے
ایسے تفتہ جگر بہت سے ہوں گے
تنہائی کا خوف غربتِ مرگ سے کیا
یارانِ عزیز اُدھر بہت سے ہوں گے

ہر حرف کے ساتھ ایک دفتر نکلے
ہر قطرے میں موجزن سمندر نکلے
اس خاکِ زمانہ کو اگر چھانو تم
ہر ذرّے سے کوئی مہرِ انور نکلے

ہاں وقت تو کام کا بہت کافی ہے
دنیا کی ابھی فضا بہت کافی ہے
مرنے کے لیے بہانے کیوں ڈھونڈتا ہے
تو سانس تو لے ہوا بہت کافی ہے

ہر شمع یہاں سیاہ ہو جاتی ہے
ہر بادِ نسیم آہ ہو جاتی ہے
آسی وہ فضا ہے میرے غمخانے کی
ہر چیز جہاں تباہ ہو جاتی ہے

غربت کی نمود میری منزل میں ہے
تنہائی محیط میری محفل میں ہے
دل میرا ہے اور وہ مجھ سے ہے دور بہت
دل پاس ہو اُسکے وہ مرے دل میں ہے

دی ہے تمھیں عقل اور بصیرت دی ہے
اچھی بُری سرنوشتِ قسمت دی ہے
نا دادہ و دادہ کی شکایت کیسی
کیا آپ نے کچھ خدا کو قیمت دی ہے

آمادہ ہے دل کہ اب عبادت نہ کرے
اور نفس ہے مستعد کہ طاعت نہ کرے
رحمت کے ہیں الغرض سب اسباب بہم
اب اُسکی خوشی ہو گر وہ رحمت نہ کرے

مسدود ہے مسلکِ وفا میرے لیے
باقی نہیں محفلوں میں جا میرے لیے
ممنونِ کرم ہوں دوستوں کا آسی
سب نے مجھے وقف کر دیا میرے لیے

ہم بھی ہیں اسی جہاں کے رہنے والے
ہم بھی ہیں یہاں کے رنج سہنے والے
کچھ ہم پہ کھلے ہیں راز ہم کہتے ہیں
کچھ اور کہیں گے آ کے کہنے والے

یا فردِ عمل تمام جل جانے دے
یا صورتِ حال کو بدل جانے دے
یا کچھ بھی نہ کر سکے تو اے میرے خدا
اپنی حدِ ملک سے نکل جانے دے

نیکی کے لباس میں برائی کی ہے
بیخود بن بن کے خود نمائی کی ہے
جبتک کہ خدا کے خوف سے تھا آزاد
خود میں نے بھی مدتوں خدائی کی ہے

اے خاکِ مزار سے گزرنے والے
اے قبر کو پائمال کرنے والے
دیوانہ نہ بن ٹھہر ذرا ہوش میں آ
پھر اٹھیں گے ایک روز مرنے والے

گو موسمِ گل نشاط کا ضامن ہے
گو سنِ شباب سب سے اچھا سن ہے
لیکن جو پیے تو روز آدینہ میں پی
سنتے ہیں کہ یہ بڑا مبارک دن ہے

سو مرتبہ میں نے جانچ اس کی کی ہے
یہ رنگِ چمن نظر کی نیرنگی ہے
تو جس کو بہار جانتا ہے آسی
وہ فصلِ خزاں نے ایک کروٹ لی ہے

انساں ہستی کا اپنی کیا مالک ہے
مملوک بلا ہے وہ بلا مالک ہے
بھیجا تھا اُسے خدا نے بندوں کی طرف
بندوں نے کہا کہ جا خدا مالک ہے

اُجڑا ہے یہ گھر خراب ہونے کے لیے
جلتا ہے یہ دل کباب ہونے کے لیے
اس شمع کو سوزِ دل سے کیا نسبت ہے
جو آگ ہوئی ہے آب ہونے کے لیے

صحت بھی ہے درد بھی ہے درماں بھی ہے
راحت بھی ہے روح بھی ہے ریحاں بھی ہے
ہے کفر صریح شکوۂ عشق و وفا
یہ دل بھی ہے دیں بھی ہے ایماں بھی ہے

اے فکرِ حیات کیوں ستاتی ہے مجھے
بے فائدہ کس لیے جگاتی ہے مجھے
اک عالمِ خواب منتظر ہے میرا
سونے دے ذرا کہ نیند آتی ہے مجھے

رنگیں شفق سے حسنِ زیبا لے گی — تاروں سے بہاے خونِ دنیا لے گی
اے چرخِ بریں بتائے دیتے ہیں تجھے — یہ پستِ زمیں تجھسے بدلا لے گی

دریاے وجود سے گزرنا کیا ہے — جینا کیا شے ہے اور مرنا کیا ہے
یہ باتیں تو جو ہیں سب ہیں فرصت کے لیے — یہ سوچ رہا ہوں مجکو کرنا کیا ہے

آغاز کا غم نہ فکرِ انجام کرے — جو کام ہوا نہیں ہے وہ کام کرے
جنت کیا ہے جو آج گاہک ہو کوئی — واعظ فوراً خدا کا نیلام کرے

ہم راہ سے اپنی نہیں ٹلنے والے — فقرے نہیں واعظوں کے چلنے والے
ہم تابعِ حکمِ کاتبِ قسمت ہیں — یہ کون ہیں قسمتیں بدلنے والے

کیوں اہلِ گنہ میں دل نہ شامل ہو جاے — کیوں سوے گناہ یہ نہ مائل ہو جاے
ایسا تقویٰ بھی کوئی تقویٰ ہے بھلا — اک جامِ شراب سے جو زائل ہو جاے

جب شاخِ امید و آرزو پھلتی ہے ساغر میں صراحی سے جو مے ڈھلتی ہے
دل آتشِ تر میں ڈوب کر کہتا ہے دوزخ کس انتظار میں جلتی ہے

آزادیِ دل کو قید کیوں کرتا ہے بیکار یہ مکر و شید کیوں کرتا ہے
رازق ہے خدا تو اے خدا کے بندے تو منتِ عمرو زید کیوں کرتا ہے

کی دور مذلّتِ تباہی تو نے دی حالتِ فقر میں بھی شاہی تو نے
بس یونہی نباہنا ہمیشہ ساقی جس طرح کہ آج تک نباہی تو نے

جو کچھ کہ جنابِ شیخ کا دعویٰ ہے رندوں نے بھی اُس کو آزما دیکھا ہے
میخانے میں مے ہے شیشہ و ساغر ہے مسجد میں سوائے بوریے کے کیا ہے

کیوں شاہد و ساقی و مغاں سے ملیے کیا فائدہ کس لیے جہاں سے ملیے
واعظ میں صفات ہیں زمانے بھر کے حجرے میں کبھی بڑے میاں سے ملیے

تقدیر خراب تھی تو تدبیر نہ کی — تخریب کے ساتھ فکرِ تعمیر نہ کی
کچھ ویسے بھی زندگی تھی بیکار سی چیز — کچھ ہم نے بھی زندگی کی توقیر نہ کی

پیمانِ وفا کو توڑنے والی ہے — رشتہ اوروں سے جوڑنے والی ہے
کہہ دو دنیا نہ چھوڑنے والوں سے — دنیا خود اُن کو چھوڑنے والی ہے

یا مرکزِ رنج و غم سے ٹلنے کے لیے — یا قیدِ حواس سے نکلنے کے لیے
کیا وہ بھی گناہ میں ہی شامل آسی — پیتا ہوں جو ذائقہ بدلنے کے لیے

دنیائے دنی کو نذرِ عقبیٰ کر دے — اپنا نہ سہی یہ کام حق کا کر دے
لاکھوں کی ہیں قضا نمازیں تو نے — اک روز گناہ کو بھی ناغا کر دے

طاعت کیسی امیدِ طاعت کیسی — اور دولتِ فقر کی اضاعت کیسی
دریوزہ گرِ کرم ہوں تیرے در پر — اس حال میں اے خدا تجارت کیسی

رنجوں سے ذرا پناہ لی تھی میں نے
تھوڑی سی چھپا کے رات پی تھی میں نے
ہے صبح کو صوفیوں میں ہنگامہ بپا
ایسی کوئی بات تو نہ کی تھی میں نے

اے تازہ گلِ فضائے امکاں ہنس لے
اے عشرتِ بلبلِ غزلخواں ہنس لے
ہوگا تو سحر کو دامنِ گلچیں میں
شب بھر اے رونقِ گلستاں ہنس لے

شبنم ہے چمن میں پانی ہونے کے لیے
گل ہنستا ہے صرف جان کھونے کے لیے
کیوں بود و نبود کو نہ سمجھوں یکساں
ہونا ہے یہاں کا جب نہ ہونے کے لیے

غم اس سے خیال و خواب ہو جاتا ہے
نا اہل بھی فیضیاب ہو جاتا ہے
ملتے ہی شرابِ عشق سے اے آسی
شیشہ خود بھی شراب ہو جاتا ہے

ہے شعبدۂ نمود ہستی میری
اس پر بھی ہے یہ دراز دستی میری
کرتی ہے بلندیوں کو محکوم اپنا
بڑھتی جاتی ہے جتنی پستی میری

تھی درسِ غمِ وفا کی اس کو جلدی — میں نے اُسے سوزِ دل کی اک مشعل دی
لیکن شبِ ہجر شمعِ بالیں سے مرے — اک سوزشِ ناتمام لے کر چل دی

تقدیر سے عرض التجا کرتی ہے — امید حصولِ مدعا کرتی ہے
دربارِ وفا اک ذرا ہوش میں رہ — اے حسرتِ ناصبور کیا کرتی ہے

دل خوش ہو تو آہ بھی جگر سے نکلے — ہنستے ہوئے اشک چشمِ تر سے نکلے
پینا ہے تو پی کے شب کو توبہ کر لے — سورج کیا جانے کل کدھر سے نکلے

آلامِ زمانہ کا تحمل ہی سہی — مال و دولت نہیں توکّل ہی سہی
لے جائیے داغِ حسرت اس دنیا سے — گلشن نہ ملا تو خیر اک گُل ہی سہی

وہ شیخ کہ برگزیدۂ عالم ہے — آدابِ امورِ دیں سے نامحرم ہے
ظاہر باطن میں کچھ توازن ہی نہیں — داڑھی ہے بڑھی ہوئی تو ایمان کم ہے

اے وہ کہ تو مر رہا ہے راحت کے لیے — بیتاب ہے بادہ ہائے جنت کے لیے
جنت پیچھے ہے اور قیامت پہلے — ہے بھی ترے پاس کچھ قیامت کے لیے

لذت نہ شرابِ جام میں ہے ساقی — ندرت نہ سرِ تمام میں ہے ساقی
مے آبِ حرام ہے بقولِ واعظ — جو کچھ ہے مزہ حرام میں ہے ساقی

جو باغِ وجود کے گلِ رعنا تھے — فردِ کامل تھے نیک تھے دانا تھے
ان کو یہ خبر نہیں کہ مرنے کے بعد — کس حال میں تھے کہاں تھے کیوں تھے کیا تھے

ہے اُس کی بہار بھی اُجڑنے کے لیے — ہے اس کا ملاپ بھی بچھڑنے کے لیے
یہ حال ہے آدمی کا لیکن پھر بھی — تیار ہے وہ خدا سے لڑنے کے لیے

دنیا فقط اتنی ہی عنایت کردے — اتنا ہی ادا حقِ مروت کردے
رہنے کے لیے جگہ نہ دی تو نہ سہی — اب ہم کو خوشی کے ساتھ رخصت کردے

توفیق ہدایتِ عمل دیتی ہے   تقدیر کا راستہ بدل دیتی ہے
میں نے یہ تجربہ کیا ہے برسوں   ہمت قسمت کا سر کچل دیتی ہے

دم میں انساں ملول ہو جاتا ہے   دم میں مقصد حصول ہو جاتا ہے
دلتنگیِ زندگی سے مغموم نہ ہو   غنچہ شب بھر میں پھول ہو جاتا ہے

عبرت دل کو جگا نہیں دیتی ہے   قسمت کوئی پتا نہیں دیتی ہے
ہمت بڑھتی ہے جب خدا کی جانب   غفلت اُسے راستا نہیں دیتی ہے

اے بخت مے و گل و گلستاں دیدے   یا شبنم و صبح و ابر و باراں دیدے
ہنسنے کے لیے جو دل نہ دے تو نہ سہی   رونے کے لیے ہی چشمِ گریاں دیدے

سیماب نے کس سے بیقراری سیکھی   شبنم نے کہاں یہ آہ و زاری سیکھی
کانٹوں نے خلش کا راز کیونکر جانا   سب نے ایک ایک خو ہماری سیکھی

ہنسنا گُل کو سکھا دیا ہے تم نے
رونا ہم کو بتا دیا ہے تم نے
ابتک ہے وہ گامزن اُسی رستے پر
جس کو جس پر لگا دیا ہے تم نے

ساقی کیوں لب پہ یہ فغاں رکھا ہے
کیوں شیشہ و جام کو نہاں رکھا ہے
یہ گوشۂ صحنِ باغ یہ عالمِ ہُو
اللہ بھلا یہاں کہاں رکھا ہے

واعظ مجھے کیوں بُرا بھلا کہتا ہے
کیا اس کا لیا ہے میں نے کیا کہتا ہے
میں بھی تو خدا کے حکم میں ہوں آخر
کرتا ہوں وہی کہ جو خدا کہتا ہے

ہر شے میں ترا ظہور سمجھا میں نے
ہر شے میں کرم کا نور سمجھا میں نے
ظاہر ہے وہ میری کثرتِ عصیاں سے
جتنا تجکو غفور سمجھا میں نے

اے شمع عبث ہے ضوفشانی تیری
دو دن بھی نہیں ہے زندگانی تیری
اس وقت تو ہنس رہی ہے محفل میں مگر
کل خاک رہے گی کچھ نشانی تیری

حاسد ہیں نہ خود غرض نہ کینے والے
ظالم ہیں نہ بد نہ بد قرینے والے
آج اُن سے ملائیں گے تجھے اے زاہد
آتے ہوں گے شراب پینے والے

یہ چاکِ حیات ہے سِلے یا نہ سِلے
ہے غنچۂ آرزو کِھلے یا نہ کِھلے
لے دے کے کفن ہے حاصلِ دولتِ عمر
اُس کی بھی خبر نہیں ملے یا نہ ملے

ہیں مستِ طرب بڑی خرابی یہ ہے
بڑھتی ہے طلب بڑی خرابی یہ ہے
مل بھی جائیں جو دولت و حشمت و جاہ
فانی ہیں یہ سب بڑی خرابی یہ ہے

تو نے مرے دل کا شیشہ کیوں توڑا ہے
آشوبِ زمانہ سے نتیجا کیا ہے
دنیا کے دلوں کو یہ کرے گا مجروح
اک نشترِ تیز اس کا ہر ذرا ہے

ہاں شورشِ سعی زینتِ امکاں ہے
کوشش وجہِ حیاتِ جاویداں ہے
اے بحرِ وجود کے شناور ہشیار
جس جا کہ سکوں ہوا وہیں طوفاں ہے

کتبہ قیصر مرزا لکھنؤ